بسم اللہ الرحمن الرحیم

کتاب : اصول حیات

مؤلف : مولانا سید عمران حیدر عابدی غازی پور قم

نظر ثانی : مولانا سید ثقلین حیدر رضوی غازی پور قم

مولانا ندیم الحسن پاکستان قمی

تحقیق : مولانا سید فیض ظفر رضوی بیہار قم

تصحیح : استاد محترم مولانا سید ضرغام حیدر رضوی آلہ آباد قم

فہرست کتاب

1: تین چیزیں ہر ایک کو ملتی ہیں:

1. خوشی
2. غم
3. موت

2: تین چیزیں ہر ایک کی الگ الگ ہوتی ہیں:

1. صورت
2. سیرت
3. قسمت

3: تین باتوں کو کبھی جھوٹا نہ سمجھو:

1. قرض
2. فرض
3. مرض

4: تین چیزوں کو کبھی نہ ٹھکراو:

1. دعوت
2. تحفہ
3. مشورہ

5: تین چیزوں کو ہر کوئی اپنا لے:

1. صبر
2. رزق
3. شکر

6: تین چیزوں کو ہمیشہ پاک رکھو :

1. جسم
2. لباس
3. خیالات

7: تین چیزوں کو ہمیشہ یاد رکھو :

1. نعمت
2. احسان
3. موت

8: تین چیزوں کو ہمیشہ حاصل کرو :

1. علم
2. اخلاق
3. ہنر

9: تین چیزوں سے پرہیز کرو :

1. حسد
2. غیبت
3. چغلخوری

10: تین چیزوں کو ہمیشہ قابو میں رکھو :

1. زبان
2. غصہ
3. نفس

11: تین چیزوں کے لیے لڑو :

1. وطن
2. حق
3. عزت

12: تین چیزیں ہمیشہ واپس نہیں آتیں :

1. زندگی
2. وقت
3. جوانی

(خوشی)

وَ لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا مُوۡسٰی بِاٰیٰتِنَاۤ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ وَ مَلَا۟ئِہٖ فَقَالَ اِنِّیۡ رَسُوۡلُ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ﴿سورہ زخرف آیت ۴۶﴾۔ اور ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیاں دے کر فرعون اور اس کے درباریوں کی طرف بھیجا، پس موسیٰ نے کہا: میں رب العالمین کا رسول ہوں۔

فَلَمَّا جَآءَہُمۡ بِاٰیٰتِنَاۤ اِذَا ہُمۡ مِّنۡہَا یَضۡحَکُوۡنَ﴿سورہ زخرف آیت ۴۷﴾ پس جب وہ ہماری نشانیاں لے کر ان کے پاس آئے تو وہ ان نشانیوں پر ہنسنے لگے۔

تفسیر آیات

۱۔ اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون اور اس کے درباریوں کی طرف اس لیے بھیجا چونکہ باقی لوگ اپنی ذاتی و استقلالی فکری حیثیت نہیں رکھتے تھے سب فرعون اور اس کے درباریوں کے تابع تھے۔

۲۔ فَقَالَ اِنِّیۡ رَسُوۡلُ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ: حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے بے سہارا فرعون جیسے طاغوت کے سامنے ایسی بات کرتا ہے جو اس کے تخت و طاغوت کے خلاف ہے۔ اس کے خلاف حضرت موسیٰ کا یہ کہنا میں عالمین کے رب کا نمائندہ ہوں فرعون کی سلطنت کے غیر قانونی ہونے کا اعلان تھا۔

اس میں رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے تسلی اور مشرکین کے اس قول کا جواب ہے

کہ اللہ نے طائف اور مکے کے کسی بڑے آدمی کو اپنا نمائندہ کیوں نہیں بنایا؟

۳۔ فَلَمَّا جَآءَہُمۡ: چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات دیکھ کر بھی وہ متاثر ہونے کی جگہ معجزات کا تمسخر اڑاتے تھے۔ ان لوگوں کی منطق بھی طبقاتی بنیادپر قائم تھی جو آج کے مشرکین کی ہے۔

(غم)

وَ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰۤی اُمِّ مُوۡسٰۤی اَنۡ اَرۡضِعِیۡہِ ۚ فَاِذَا خِفۡتِ عَلَیۡہِ فَاَلۡقِیۡہِ فِی الۡیَمِّ وَ لَا تَخَافِیۡ وَ لَا تَحۡزَنِیۡ ۚ اِنَّا رَآدُّوۡہُ اِلَیۡکِ وَ جَاعِلُوۡہُ مِنَ الۡمُرۡسَلِیۡنَ﴿سورہ قصص آیت ۷﴾اور ہم نے مادر موسیٰ کی طرف وحی بھیجی کہ انہیں دودھ پلائیں اور جب ان کے بارے میں خوف محسوس کریں تو انہیں دریا میں ڈال دیں اور بالکل

خوف اور رنج نہ کریں، ہم انہیں آپ کی طرف پلٹانے والے اور انہیں پیغمبروں میں سے بنانے والے ہیں۔

تشریح کلمات

الْیَمِّ:سمندر اور دریا دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰۤی اُمِّ مُوْسٰۤی: ہم نے مادر موسیٰ کی طرف وحی بھیجی۔ وحی، کلام خفی اور پوشیدہ اشارے کے معنوں میں ہے۔ یہ کلام خفی اگر حروف و اصوات پر مشتمل ہے تو اصطلاح میں بھی وحی کہتے ہیں اور اگر حروف و اصوات کے بغیر صرف معانی و مطالب ذہن میں ڈال دے جائیں تو اسے الہام کہتے ہیں۔ اگر یہ تفہیم کسی کے تخلیقی مرحلے میں اس میں ودیعت کی گئی ہے تو اسے فطرت کہتے ہیں۔ چنانچہ وَ اَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ ---- (۱۶ نحل: ۶۸) میں یہی معنی مراد ہیں۔

مادر موسی کو وحی بمعنی الہام ہوئی ہے۔ یعنی ان کے دل میں یہ باتیں ڈال دی گئیں۔

۲۔ اَنۡ اَرۡضِعِیۡہِ: اسے دودھ پلائیں۔ جب تک فرعون کی طرف سے خطرہ لاحق نہیں ہے اسے اپنے پاس رکھیں اور دودھ پلاتی رہیں۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہوئی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دریا میں ڈالنے سے پہلے جتنی مدت ماں کے پاس رکھا گیا، وہ حکم خدا سے رکھا گیا ہے۔

۳۔ فَاِذَا خِفۡتِ عَلَیۡہِ فَاَلۡقِیۡہِ فِی الۡیَمِّ: جب یہ خوف لاحق ہو جائے کہ فرعونیوں کو اس کے بچےکی ولادت کا علم ہو جائے گا اور وہ اسے ذبح کر دیں گے تو اس وقت اسے دریا میں ڈال دیں۔ الۡیَمِّ سے مراد یہاں دریائے نیل ہی ہو سکتا ہے چونکہ قصر فرعون دریائے نیل کے ساحل پر واقع تھا۔

تلمود کے مطابق فرعون نے جاسوس عورتیں چھوڑ رکھی تھی جو بنی اسرائیل کے گھروں میں اپنے چھوٹے بچے لے جاتی تھیں اور ان بچوں کو رلا دیتی تھیں تاکہ اگر کوئی بچہ چھپا ہوا ہے تو وہ آواز سن کر روئے اور یوں اس بچے کو حاصل کر کے قتل کروا دیں۔

۴۔ وَ لَا تَخَافِیۡ وَ لَا تَحۡزَنِیۡ: موسیٰ کی زندگی پر خوف نہ کرو اور جدائی کا غم بھی نہ کرو۔

آنے والے خطرات کی صورت میں خوف ہوتا ہے۔ گزشتہ مصیبت پر حزن ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان میں دونوں صورتوں کے لیے تسلی ہے۔ موسیٰ زندگی کے لیے آیندہ خطرات کا خوف نہ کرو اور دریا میں ڈالنے کے بعد جدائی کا غم نہ کرو۔ چونکہ یہ جدائی وقتی ہو گی۔

۵۔ نَّا رَآدُّوۡهُ اِلَيۡكِ: ہم اس بچے کو آپ کی طرف واپس کریں گے۔ آپ بچے کو دریا میں ڈال دیں۔ بچہ آپ کو واپس ملے گا۔ اس یقین دہانی پر مادر موسیٰ کو یقین آنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس الہام کی نوعیت ایسی تھی جس سے ماں کی مامتا کو بچے کی زندگی کے بارے میں یقین آ گیا۔

۶۔ وَ جَاعِلُوۡهُ مِنَ الۡمُرۡسَلِيۡنَ: ہم اس بچے کو مرسلین میں سے بنانے والے ہیں۔ اس پیشگوئی اور خوشخبری سے اندازہ ہوتا ہے کہ مادر موسی کو الہام کے ذریعے ملنے والا پیغام ایک خاص نوعیت کے الہام کے ذریعہ تھا نیز یہ بھی ہو سکتا ہے بنی اسرائیل ایک نجات دہندہ رسول کے انتظار میں تھے، مادر موسیٰ کو الہام و دیگر علامات سے معلوم ہوا ہو کہ یہ وہی نبی ہیں جس کے وہ انتظار میں تھے۔

اہم نکات

۱۔ خدا پر توکل اپنے جگر گوشے کو دریا کے حوالے کرنے پر آمادہ کر دیتا ہے۔

(موت)

قَالُوْا رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَ اَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِيْلٍ﴿سورہ غافر آیت ۱۱﴾

وہ کہیں گے: اے ہمارے پروردگار! تو نے ہمیں دو مرتبہ موت اور دو مرتبہ زندگی دی ہے،اب ہم اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں تو کیا نکلنے کی کوئی راہ ہے؟

تفسیر آیات

۱۔ قَالُوۡا رَبَّنَاۤ اَمَتَّنَا اثۡنَتَیۡنِ: کفار اس پکار کے جواب میں کہیں گے: دو مرتبہ موت اور دو مرتبہ زندگی کے بعد تو ہم حقیقت کو سمجھ گئے ہیں۔ اب اعتراف گناہ کے مرحلے پر آ گئے ہیں۔

بعض کے نزدیک پہلی موت وہ ہے جو دنیا میں آتی ہے۔ پھر برزخی زندگی پہلا احیاء ہے، پھر برزخی زندگی کو دوسری موت دی جاتی ہے۔ پھر قیامت کی زندگی دوسرا احیاء ہے۔

بعض کے نزدیک پہلی موت وہ ہے جو اس زندگی سے پہلے تھی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

کَیۡفَ تَکۡفُرُوۡنَ بِاللّٰہِ وَ کُنۡتُمۡ اَمۡوَاتًا فَاَحۡیَاکُمۡ۔۔۔ (۲ بقرہ: ۲۸)اللہ کے بارے میں تم کس طرح کفر اختیار کرتے ہو؟ حالانکہ تم بے جان تھے اللہ نے تمہینحیات دی۔

اس آیت کے مطابق پہلی زندگی دنیوی زندگی ہے۔ دوسری موت وہ ہے جو دنیوی زندگی کا خاتمہ کرے اور دوسری حیات قیامت کی زندگی ہے۔ یہی نظریہ ہمارے نزدیک قرین واقع ہے۔

جب ان کافروں کو دوسری بار زندہ کیا جائے گا تو پردے ہٹ چکے ہوں گے۔ حقائق سامنے آ جائیں گے تو اپنے گناہوں کا اعتراف کریں گے۔

۲۔ فَہَلۡ اِلٰی خُرُوۡجٍ مِّنۡ سَبِیۡلٍ: اس ہولناک عذاب کا منظر دیکھ کر مایوسانہ استفہامیہ جملہ کہیں گے: کیا اس عذاب سے نکلنے کا کوئی راستہ ہے؟ خود انہیں معلوم ہو چکا ہو گا کوئی راستہ نہیں ہے۔

اہم نکات

۱۔ مشاہدۂ عذاب کے بعد آرزوئے نجات ہر کافر کرے گا۔

وَ لَا تَحۡسَبَنَّ الَّذِیۡنَ قُتِلُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ اَمۡوَاتًا ؕ بَلۡ اَحۡیَآءٌ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ یُرۡزَقُوۡنَ﴿سورہ آل عمران آیت ۱۶۹﴾

اور جو لوگ راہ خدا میں مارے گئے ہیں قطعاً انہیں مردہ نہ سمجھو بلکہ وہ زندہ ہیں، اپنے رب کے پاس سے رزق پا رہے ہیں۔

فَرِحِیۡنَ بِمَاۤ اٰتٰہُمُ اللّٰہُ مِنۡ فَضۡلِہٖ ۙ وَ یَسۡتَبۡشِرُوۡنَ بِالَّذِیۡنَ لَمۡ یَلۡحَقُوۡا بِہِمۡ مِّنۡ خَلۡفِہِمۡ ۙ اَلَّا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ﴿سورہ آل عمران آیت ۱۷۰﴾

اللہ نے اپنے فضل سے جو کچھ انہیں دیا ہے اس پر وہ خوش ہیں اور جو لوگ ابھی ان کے پیچھے ان سے نہیں جا ملے ان کے بارے میں بھی خوش ہیں کہ انہیں (قیامت کے روز) نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ وہ محزون ہوں گے۔

يَسۡتَبۡشِرُوۡنَ بِنِعۡمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضۡلٍ ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيۡعُ اَجۡرَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿سورہ آل عمران آیت ۱۷۱﴾

وہ اللہ کی عطا کردہ نعمت اور اس کے فضل پر خوش ہیں اور اس بات پر بھی کہ اللہ مومنوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ لَا تَحۡسَبَنَّ الَّذِيۡنَ قُتِلُوۡا: موت شعور سلب ہونے سے عبارت ہے۔ شہید چونکہ رزق پاتے ہیں، لہٰذا وہ شعور کی زندگی گزار رہے ہیں اور خوشی بھی شعور کی علامت ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ آخرت میں مومنین کے لیے جو ثواب مہیا کر رکھا ہے، وہ ان کی موت سے پہلے ہی اس کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

۲۔ بَلۡ اَحۡیَآءٌ: اللہ سے رزق حاصل کرنے کا ایک لازمہ یہ ہے کہ اس رزق کے بعد نہ خوف رہتا ہے نہ حزن و ملال۔ کیونکہ جب کسی موجود اور میسر خوبی و آسائش کے سلب ہونے کا خطرہ ہو تو خوف لاحق ہوتا ہے اور اگر کوئی چیز سلب ہو جائے تو حزن و ملال ہوتا ہے۔ اخروی زندگی میں رب کی بارگاہ سے رزق پانے کے بعد اس کے سلب ہونے کاکوئی خطرہ قابل تصور نہیں ہے۔ لہٰذا کسی قسم کے خوف کا بھی وہاں تصور نہیں ہے نیز یہ رزق ابدی ہے، لہٰذا اس کے چھن جانے کی نوبت نہیں آ سکتی، اس لیے حزن بھی قابل تصور نہیں ہے۔ (شہداء کی حیات کے بارے میں مزید تفسیر کے لیے ملاحظہ فرمائیں بقرہ : ۱۵۴)

۳۔ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ: اپنے رب کے پاس زندہ ہیں۔ اس سے ان کی حیات کی نوعیت کا اندازہ ہوتا ہے کہ یہ حیات دنیوی حیات کی طرح بھی نہیں ہے اور باقی

ارواح کی حیات کی طرح بھی نہیں ہے، بلکہ ایک خاص حیات ہے۔

اس آیت میں شہیدوں کی حیات کے چند آثار بیان ہوئے ہیں:

i ۔ اللہ کے پاس سے رزق پاتے ہیں۔ ظاہر ہے رزق سے لذت پاتے ہیں، محظوظ ہوتے ہیں۔

ii ۔ فَرِحِيْنَ: اللہ نے اپنے فضل سے جو کچھ دیا ہے اس پر خوش ہیں۔ جس رزق کا پہلے ذکر ہوا ہے، یہ اس پر مزید فضل و کرم کا ذکر ہے۔

iii ۔ وَ يَسْتَبْشِرُوْنَ: جو زندگی شہیدوں کو مل رہی ہے، وہ اس قدر کیف و سرور کی زندگی ہے کہ وہ

اپنے آنے والے دوستوں کے لیے بھی اس زندگی کے ملنے کی خوشی سے محظوظ ہو رہے ہیں۔

iv ۔ اس پر مزید نعمت و فضل الٰہی پر خوش ہیں: بِنِعۡمَۃٍ مِّنَ اللّٰہِ وَ فَضۡلٍ۔

v ۔ وَّ اَنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیۡعُ اَجۡرَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ: یہ مکمل ادراک کہ اللہ کے ہاں اہل ایمان کا اجر ضائع نہیں جاتا، یہاں ناقدری نہیں ہوتی۔ یہ ادراک خود اپنی جگہ ایک بہت بڑی نعمت ہے، اللہ تعالیٰ کی صفات کے ادراک سے بھی کیف و سرور حاصل ہو گا۔

اہم نکات

۱۔ ہر نعمت کا سرچشمہ اللہ کی ذات ہے: بِنِعۡمَۃٍ مِّنَ اللّٰہِ وَ فَضۡلٍ ۔

۲۔ شہیدوں کو خوف اور غم سے پاک زندگی ملے گی۔

صورت

اَللّٰهُ الَّذِیۡ خَلَقَ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ وَّ مِنَ الۡاَرۡضِ مِثۡلَهُنَّ ؕ یَتَنَزَّلُ الۡاَمۡرُ بَیۡنَهُنَّ لِتَعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ قَدۡ اَحَاطَ بِکُلِّ شَیۡءٍ عِلۡمًا ﴿سورہ طلاق آیت ۱۲﴾

وہی اللہ ہے جس نے سات آسمان بنائے اور انہی کی طرح زمین بھی، اس کا حکم ان کے درمیان اترتا ہے تاکہ تم جان لو کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے اور یہ کہ اللہ نے بلحاظ علم ہر چیز پر احاطہ کیا ہوا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اَللّٰہُ الَّذِیۡ خَلَقَ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ: کیا تم اس اللہ کی ربوبیت اور تدبیر کے منکر ہو جس نے سات آسمانوں کو بنایا جو انسان کی تخلیق سے زیادہ باعظمت ہے۔

۲۔ وَّ مِنَ الۡاَرۡضِ مِثۡلَہُنَّ: اور آسمانوں کی طرح زمین بھی۔ زمین بھی آسمانوں کی طرح بنائی۔ اس میں چند ایک احتمالات بیان کیے گئے ہیں:

الف: مِثۡلَہُنَّ سے مراد تعداد ہے۔ یعنی زمین بھی سات ہیں اور سات سے مراد کثرت بیان کرنا ہے۔ جیسے سات اور ستر کا لفظ محاورے میں کثرت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

ب: اس سے مراد ہفت اقلیم ہے۔

ج: اس سے سات طبقات ارضی مراد ہیں۔

د: مِثۡلَہُنَّ سے مراد عناصر ہیں۔ آسمانوں کو جن عناصر سے بنایا ہے زمین بھی انہیں عناصر سے مرکب ہونے میں آسمان کی مانند ہے۔

ھ: بعض نے کہا وَّ مِنَ الۡاَرۡضِ مِثۡلَہُنَّ سے مراد خلق من الارض مثل السموات السبع۔ زمین سے ایسی مخلوق بنائی ہے جو عظمت میں سات آسمانوں کی مانند ہے اور وہ انسان ہے۔

و: وَّ مِنَ میں مِن زائدہ ہے اور مِثۡلَہُنَّ کا مطلب یہ ہے کہ زمین کی تخلیق آسمان کی طرح ہوئی ہے۔ یعنی کن فیکون ، ایک ارادہ الٰہی سے ای خلق الارض مثل السموات۔

بہرحال مِثۡلَہُنَّ کی جو تفسیر اختیار کی جائے۔

اس کائنات میں ہماری زمین کی طرح کے دوسرے بے شمار کرات کا ہونا ایک قدرتی بات ہے۔ کہتے ہیں: صرف ہمارے کہکشاں میں ۶۰ کروڑ ایسے کرات موجود ہیں جو ساخت و بافت اور طبعی حالات میں ہماری زمین کے مشابہ ہیں۔

لہٰذا بہتر یہی ہے کہ وَّ مِنَ الۡاَرۡضِ مِثۡلَہُنَّ کی تفسیر سے اپنی عاجزی کا اظہار کیا جائے۔ ممکن ہے آیندہ نسلوں کے لیے اس جملے کی تفسیر ممکن ہو جائے۔

سات زمینوں کے بارے میں ابوہریرہ کی روایت جو امام احمد بن حنبل اور ترمذی نے نقل کی ہے

قابل تعجب ہے۔ ابوہریرہ کہتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا:

لو انکم دلیتم بحبل الی الارض السفلی لھبط علی اللہ۔اگر تم نے کوئی رسی پائین ترین زمین کی طرف لٹکا دی تو وہ اللہ پر گرے گی۔

اور جو تاویل منقول ہے کہ اللہ سے مراد علم خدا ہے، عذر گناہ بدتر از گناہ ہے کہ علم خدا زیرین زمین پر موجود ہے؟

۲۔ یَتَنَزَّلُ الۡاَمۡرُ بَیۡنَہُنَّ: بظاہر آسمانوں اور زمین کے درمیان حکم الٰہی نازل ہوتا ہے۔ الۡاَمۡرُ سے مراد امر ایجادی ہو سکتا ہے اور امر تدبیری بھی ہو سکتا ہے۔ جس طرح فرمایا:

وَ اَوۡحٰی فِیۡ کُلِّ سَمَآءٍ اَمۡرَہَا۔۔۔ (۴۱ فصلت: ۱۲)

اور ہر آسمان میں اس کا حکم پہنچا دیا۔

ہر آسمان کا نظام، زمان و مکان دوسرے سے مختلف ہو سکتا ہے۔ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سورہ حٰمٓ سجدہ آیت ۱۲۔

۳۔ لِتَعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ: کائنات کی تخلیق اور ان میں موجود نظام اس لیے ہے کہ موجودات عاقل کو علم ہو جائے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ زندگی کو دوبارہ پیدا کرنا یا اس کائنات کو ختم کر کے نئی کائنات کا بنانا اللہ کے لیے آسان ہے۔

۴۔ وَّ اَنَّ اللّٰہَ قَدۡ اَحَاطَ بِکُلِّ شَیۡءٍ عِلۡمًا: اور یہ بات جاننے کے لیے کہ اللہ تعالیٰ کے احاطۂ علمی سے کوئی چیز باہر نہیں ہے۔ کوئی پتا نہیں گرتا مگر اللہ کو اس کا علم ہو جاتا ہے۔

سیرت

وَ عِبَادُ الرَّحۡمٰنِ الَّذِیۡنَ یَمۡشُوۡنَ عَلَی الۡاَرۡضِ ہَوۡنًا وَّ اِذَا خَاطَبَہُمُ الۡجٰہِلُوۡنَ قَالُوۡا سَلٰمًا﴿سورہ فرقان آیت ۶۳﴾

اور رحمن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر (فروتنی سے) دبے پاؤں چلتے ہیں اور جب جاہل ان سے گفتگو کریں تو کہتے ہیں: سلام۔

تشریح کلمات

ہَوۡنًا:(ھ و ن) الھوان ۔ نرمی اور تواضع کے معنوں میں نیز ذلت اور رسوائی کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

تفسیر آیات

آنے والی چند آیات میں عِبَادُ الرَّحْمٰنِ کی چند اہم خصوصیات بیان فرمائی ہیں:

۱۔ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ: رحمٰن کے بندے اس لیے فرمایا کہ یہ لفظ ذہنوں میں راسخ ہو جائے کہ رحمٰن اللہ تعالیٰ کے ان اسماء میں سے ہے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ مختص ہیں۔ چنانچہ یہ نام کسی غیر اللہ کے لیے نہیں بولا جاتا۔

۲۔ لَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا: رحمٰن کے بندے زمین پر تواضع کے ساتھ چلتے ہیں۔

چال انسان کی شخصیت کی ترجمانی کرتی ہے۔ مطمئن ضمیر اور فکری اعتدال رکھنے والے کی چال اور شخصیت میں خلا رکھنے والے کی چال میں فرق ہوتا ہے کیونکہ اللہ کی بندگی کرنے والوں کی شخصیت میں خلا نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ

تکبر نہیں، تواضع کرتے ہیں۔ وہ جا ہلوں کے ساتھ الجھتے نہیں ہیں۔

حدیث میں آیا ہے:

سُرْعَۃُ الْمَشْیِ یَذْہَبُ بِبَھَاءِ الْمُؤْمِنِ ۔۔۔ (وسائل الشیعۃ ۱۱: ۴۴۰)تیز قدم چلنے سے مؤمن کا وقار جاتا ہے۔
مؤمن کے اوصاف میں ایک وصف یہ ہے:

مشْیُھُمْ عَلَی الْاَرْضِ ھَوْنٌ ۔۔۔۔ (الکافی ۲: ۲۳۲)زمین پر ان کی چال باوقار ہوتی ہے۔
۳۔ وَّ اِذَا خَاطَبَہُمُ الْجٰہِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا: اگر جاہل لوگ بدتہذیبی کریں تو رحمٰن کی بندگی کرنے والے اپنے مطمئن ضمیر کا مظاہرہ تہذیب کے ساتھ کریں گے۔ الجاہل سے مراد وہ بدتہذیب مشرک ہیں

جو اسلامی تہذیب کا مذاق اڑاتے ہیں۔ بعض نے اس سے مراد بے وقوف، بے ادب مراد لیا ہے۔

قَالُوْا سَلٰمًا: سلام سے مراد اسلامی سلام نہیں ہے بلکہ یہ سلام تودیعی ہے جو لاتعلقی کے لیے بولا جاتا ہے۔ یعنی ہمارا تمہارا کوئی تعلق نہیں، ہم اپنی سلامتی چاہتے ہیں۔ اس میں بیہودہ گو لوگوں سے نہ الجھنے کی خصلت کی تعریف کی گئی ہے۔

اہم نکات

۱۔ وقار کے ساتھ چلنا، بدتہذیبوں سے نہ الجھنا عِبَادُ الرَّحْمٰنِ کے دو اوصاف ہیں۔

قسمت

لَہٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنۡۢ بَیۡنِ یَدَیۡہِ وَ مِنۡ خَلۡفِہٖ یَحۡفَظُوۡنَہٗ مِنۡ اَمۡرِ اللّٰہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوۡمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوۡا مَا بِاَنۡفُسِہِمۡ ؕ وَ اِذَاۤ اَرَادَ اللّٰہُ بِقَوۡمٍ سُوۡٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَہٗ ۚ وَ مَا لَہُمۡ مِّنۡ دُوۡنِہٖ مِنۡ وَّالٍ﴿سورہ الرعد آیت ۱۱﴾

ہر شخص کے آگے اور پیچھے یکے بعد دیگرے آنے والے پہرے دار (فرشتے) مقرر ہیں جو بحکم خدا اس کی حفاظت کرتے ہیں، اللہ کسی قوم کا حال یقینا اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت کو نہ بدلے اور جب اللہ کسی قوم کو برے حال سے دوچار کرنے کا ارادہ کر لے تو اس کے ٹلنے کی کوئی صورت نہیں ہوتی اور نہ ہی اللہ کے سوا ان کا کوئی مددگار ہوتا ہے۔

تشریح کلمات

مُعَقِّبٰتٌ:(ع ق ب) یکے بعد دیگرے آنے والے۔ اس کا مفرد معقبۃ ہے۔ تانیث نہیں بلکہ علامۃ کی تاء کی طرح مبالغہ کے لیے ہے۔ لَہٗ کی ضمیر کا مرجع وہی ہے جو یَدَیۡہِ، خَلۡفِہٖ، یَحۡفَظُوۡنَہٗ کا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ لَہٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنۡۢ بَیۡنِ یَدَیۡہِ: اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کی حفاظت کے لیے فرشتے مامور ہیں۔ فرشتہ ہائے شب اور فرشتہ ہائے روز یکے بعد دیگرے انسان کی حفاظت کے لیے آتے جاتے ہیں۔ نماز صبح کے موقع پر شب اور روز کے فرشتے اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ یہ فرشتے انسان کو ان تمام آفات سے بچاتے ہیں جو ہمیشہ انسانی وجود و بقا کے لیے مہلک ہوتی ہیں۔ انسان کے وجود کے اندر موجود مہلک چیزوں سے بچانے والے بھی موجود ہیں اور بیرونی خطرات سے بچانے والے بھی۔ طبعی اور ناگہانی آفتوں سے بچانے والے ہر گونہ محافظ موجود ہیں کہ اگر انسان کو زخم لگ جاتا ہے تو اس ناگہانی آفت سے بچانے والے اس زخم کومندمل کرتے ہیں۔ وَ اِنَّ عَلَیۡکُمۡ لَحٰفِظِیۡنَ ﴿﴾ ۔ (۸۲ انفطار: ۱۰۔ جب کہ تم پر نگران مقرر ہیں) لہٰذا ممکن ہے روز و شب کے محافظ فرشتوں کے ساتھ طبعی محافظین پر بھی مُعَقِّبٰتٌ صادق آئے۔

۲۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوۡمٍ: انسان کی محافظت کا اللہ نے ذمہ لیا ہے لیکن انسان کے اپنے اعمال و حرکات کے اثرات سے بچانے کا ذمہ نہیں لیا۔ اس میں تو اللہ از خود کسی قوم کا حال نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت نہ بدلے۔ حالات میں تغیر کی دو صورتیں ممکن ہیں:

۔ صلاح احوال کی صورت میں دوام نعمت۔i

۔ فساد احوال کی صورت میں زوال نعمت و نزول ii عذاب۔

اول الذکر کے بارے میں یہ آیت ایک کلیہ قائم کرتی ہے کہ کوئی قوم جب تک صلاح احوال میں ہے تو اس حالت میں اللہ کوئی تبدیلی نہیں لاتا جب

تک لوگ خود تبدیلی نہ لائیں۔ یہ مقام رحمانیت کے خلاف ہے کہ ایک قوم کے نیک سیرت ہونے کے باوجود اس کی نیک بختی کو بدبختی میں بدل دے۔ لہٰذا یہ ایک حتمی قانون الٰہی ہے کہ قوموں میں اگر اصلاح احوال اور نیک سیرتی عام ہے تو اللہ کی طرف سے مادی و معنوی نعمتوں میں فراوانی ہو گی۔ چنانچہ فرمایا:

ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰہَ لَمۡ یَکُ مُغَیِّرًا نِّعۡمَۃً اَنۡعَمَہَا عَلٰی قَوۡمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوۡا مَا بِاَنۡفُسِہِمۡ ۔۔۔۔(۸ انفال: ۵۳)ایسا اس لیے ہوا کہ اللہ جو نعمت کسی قوم کو عنایت فرماتا ہے اس وقت تک اسے نہیں بدلتا جب تک وہ خود اسے نہیں بدلتے۔۔۔۔

لَئِنۡ شَکَرۡتُمۡ لَاَزِیۡدَنَّکُمۡ ۔۔۔۔ (۱۴ ابراہیم: ۷)اگر تم شکر کرو تو میں تمہیں ضرور زیادہ دوں گا۔

وَ الَّذِیۡنَ جَاہَدُوۡا فِیۡنَا لَنَہۡدِیَنَّہُمۡ سُبُلَنَا ۔۔۔ (۲۹ عنکبوت: ۶۹)جو ہماری راہ میں جہاد کرتے ہیں ہم انہیں ضرور اپنے راستے کی ہدایت کریں گے۔

اِنۡ تَنۡصُرُوا اللّٰہَ یَنۡصُرۡکُمۡ وَ یُثَبِّتۡ اَقۡدَامَکُمۡ (۴۷ محمد: ۷)تم اگر اللہ کی مدد کرو تو وہ بھی تمہاری مدد کرے گا اور تمہیں ثابت قدم رکھے گا۔

وَ مَنۡ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجۡعَلۡ لَّہٗ مَخۡرَجًا وَّ یَرۡزُقۡہُ مِنۡ حَیۡثُ لَا یَحۡتَسِبُ ۔۔۔ (۶۵ طلاق: ۲۔۳)اور جو اللہ سے ڈرتا رہے اللہ اس کے لیے (مشکلات سے) نکلنے کا راستہ بنا دیتا ہے اور اسے ایسی جگہ سے رزق دیتا ہے جہاں سے وہ سوچ بھی نہ سکتا ہو۔

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنۡ تَتَّقُوا اللّٰہَ یَجۡعَلۡ لَّکُمۡ فُرۡقَانًا ۔۔۔(۸ انفال: ۲۹)اے ایمان والو! اگر تم اللہ سے ڈرو تو وہ تمہیں (حق و باطل میں) تمیز کرنے کی طاقت عطا کرے گا۔۔۔

وَ لَوۡ اَنَّ اَہۡلَ الۡقُرٰۤی اٰمَنُوۡا وَ اتَّقَوۡا لَفَتَحۡنَا عَلَیۡہِمۡ بَرَکٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الۡاَرۡضِ ۔۔ (۷ اعراف: ۹۶)اور اگر ان

بستیوں کے لوگ ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے----

وَ لَوۡ اَنَّہُمۡ اَقَامُوا التَّوۡرٰىۃَ وَ الۡاِنۡجِیۡلَ وَ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡہِمۡ مِّنۡ رَّبِّہِمۡ لَاَکَلُوۡا مِنۡ فَوۡقِہِمۡ وَ مِنۡ تَحۡتِ اَرۡجُلِہِمۡ ---- (۵ مائدہ: ۶۶)اور اگر یہ اہل کتاب توریت و انجیل اور ان کے رب کی طرف سے ان پر نازل شدہ دیگر تعلیمات کو قائم رکھتے تو وہ اپنے اوپر کی (آسمانی برکات) اور نیچے کی (زمینی برکات) سے مالا مال ہوتے۔

درج بالا آیات میں شکر کا نتیجہ فراوانی، جہاد و سعی کا لازمہ کشایش، اللہ کی نصرت کا نتیجہ، ثابت قدمی، تقویٰ کا لازمہ حق و باطل میں تمیز، ایمان و تقویٰ کا لازمہ برکتیں، قانون الٰہی کے نفاذ کا لازمہ نعمتوں کی ارزانی قرار دیا گیا ہے۔

فساد احوال کی صورت میں زوال نعمت: درج ذیل آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ فساد احوال کی صورت میں زوال نعمت و نزول عذاب ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

وَ اتَّقُوۡا فِتۡنَۃً لَّا تُصِیۡبَنَّ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا مِنۡکُمۡ خَآصَّۃً ... (۸ انفال: ۲۵)اور اس فتنے سے بچو جس کی لپیٹ میں تم میں سے صرف ظلم کرنے والے ہی نہیں بلکہ (سب) آئیں گے۔

وَ لَقَدۡ اَہۡلَکۡنَا الۡقُرُوۡنَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ لَمَّا ظَلَمُوۡا .... (۱۰: یونس ۱۳)اور بتحقیق تم سے پہلی قوموں کو بھی ہم نے اس وقت ہلاک کیا جب وہ ظلم کے مرتکب ہوئے....

وَ الَّذِیۡنَ کَسَبُوا السَّیِّاٰتِ جَزَآءُ سَیِّئَۃٍ بِمِثۡلِہَا ۙ وَ تَرۡہَقُہُمۡ ذِلَّۃٌ .... (۱۰: یونس ۲۷)اور جنہوں نے برائیوں کا ارتکاب کیا ہے تو بدی کی سزا بھی ویسی ہی (بدی) ہے اور ان پر ذلت چھائی ہوئی ہو گی....

ان آیات میں ظلم کا نتیجہ فتنہ و ہلاکت، گناہوں کا نتیجہ ذلت و خواری قرار دیا ہے۔

تاہم یہ لطف خداوندی ہے کہ اس نتیجہ کو لازمی اور ضروری قرار نہیں دیا ہے۔ چنانچہ بعض حالات میں ظلم و گناہ کے باوجود عفو فرماتا ہے۔

وَ لَوۡ یُؤَاخِذُ اللّٰہُ النَّاسَ بِظُلۡمِہِمۡ مَّا تَرَکَ عَلَیۡہَا مِنۡ دَآبَّۃٍ ۔۔۔ (۱۶ نحل: ۶۱)اور اگر لوگوں کے ظلم کی وجہ سے اللہ ان کا مواخذہ کرتا تو روئے زمین پر کسی چلنے پھرنے والے کو نہ چھوڑتا۔
وَ مَاۤ اَصَابَکُمۡ مِّنۡ مُّصِیۡبَۃٍ فَبِمَا کَسَبَتۡ اَیۡدِیۡکُمۡ وَ یَعۡفُوۡا عَنۡ کَثِیۡرٍ ﴿﴾ (۴۲شوری: ۳۰)اور تم پر جو مصیبت آتی ہے وہ خود تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے آتی ہے اور وہ بہت سی باتوں سے درگزر کرتا ہے۔

لہٰذا قوموں کا انحطاط اور تنزل ان کے اپنے اعمال کے نتیجہ میں وقوع پذیز رہتا ہے اور یہاں انسان کا اپنا عمل ہی تقدیر ساز ہے اور ہر قسم کی بدبختی اور نعمتوں سے محرومیت، اغیار کے مقابلے میں ذلت و خواری، استعمار کا تسلط اور استحصال، یہ سب قوموں کے اپنی داخلی بداعمالیوں کالازمی نتیجہ ہیں۔

اس کلیے کے تحت مسلمانوں کا انحطاط اور اغیار کے سامنے ان کی عبرتناک ذلت، ان کی اپنی داخلی بد اعمالیوں کا نتیجہ ہیں۔ انہیں بیرونی عوامل کے ذمے لگانا درست نہیں ہے کیونکہ بیرونی عوامل کے لیے داخلی عوامل زمین ہموار کرتے ہیں۔

لہٰذا زوال نعمت کے لیے انسان کے اعمال موثر ہیں، تاہم لازمی نہیں ہے اور اس کا لازمی نہ ہونا لطف الٰہی ہے۔

اسحاق بن عمار نے حضرت امام صادق علیہ السلام سے عرض کیا: یہ بتا دیجیے کہ فجر کی نماز کے لیے بہترین وقت کون سا ہے؟ آپؑ نے فرمایا:

فَقَالَ: مَعَ طُلُوعِ الْفَجْرِ۔ اَنَّ اللہ عَزَّ وَ جَلَّ یَقُولُ: وَ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ ؕ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ کَانَ مَشْہُوْدًا۔ یَعْنِی صَلَاۃَ الْفَجْرِ تَشْہَدُہُ مَلَائِکَۃُ اللَّیْلِ وَ مَلَائِکَۃُ النَّہَارِ فَاِذَا صَلَّی الْعَبْدُ الصَّبْحَ مَعَ طَلُوعِ الْفَجْرِ اُثْبِتَتْ لَہٗ مَرَّتَیْنِ اَثْبَتَہَا مَلَائِکَۃُ اللَّیْلِ وَ مَلَائِکَۃُ النَّہَارِ ۔
(الکافی۲۸۲:۳۔ الاستبصار ۱: ۲۷۵)بہترین وقت طلوع فجر کا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: صبح کی نماز بھی، بے شک صبح کی نماز حضور کا وقت

ہے۔ یعنی صبح کی نماز کے وقت رات اور دن کے فرشتے حاضر رہتے ہیں۔ جب بندہ طلوع فجرکے وقت نماز پڑھتا ہے تو یہ نماز دو بار ثبت ہو جائے گی۔ ایک رات کے فرشتے ثبت کریں گے اور ایک دن کے فرشتے۔

حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

اِنَّ مَعَ کُلِّ اَنْسَانٍ مَلَکَیْنِ یَحْفَظَانِہٖ فَاِذَا جَاءَ الْقَدَرُ خَلَّیَا بَیْنَہٗ وَ بَیْنَہٗ ...(نہج البلاغۃ حکمت: ۲۰۱)ہر انسان کے ساتھ دو فرشتے ہوتے ہیں جو اس کی حفاظت کرتے ہیں اور جب موت کا وقت آتا ہے تو وہ اس کے اور موت کے درمیان سے ہٹ جاتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ ہماری تمام مشکلات کا سرچشمہ خود ہماری اپنی بداعمالیاں ہیں اور زوال و انحطاط کے ہم خود ذمے دار ہیں۔

۲۔ تمام مشکلات کا حل بھی خود ہمارے پاس ہے۔ امتوں کو اپنی تقدیر سازی خود کرنی ہے۔

۳۔ اصلاح احوال کی صورت میں دوام نعمت ضروری ہے۔ فساد احوال کی صورت میں زوال و انحطاط آتا ہے اور اللہ درگزر بھی فرماتا ہے۔

۴۔ اللہ کے محافظین ہر انسان کو بیرونی خطرات سے بچا لیتے ہیں لیکن داخلی خطرات جو اس کے اپنے اعمال سے پیش آتے ہیں، اس کے خود ذمے دار ہیں۔

قرض

وَ مَآ اٰتَیۡتُمۡ مِّنۡ رِّبًا لِّیَرۡبُوَاۡ فِیۡۤ اَمۡوَالِ النَّاسِ فَلَا یَرۡبُوۡا عِنۡدَ اللّٰہِ ۚ وَ مَآ اٰتَیۡتُمۡ مِّنۡ زَکٰوۃٍ تُرِیۡدُوۡنَ وَجۡہَ اللّٰہِ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُضۡعِفُوۡنَ﴿سورہ روم آیت ۳۹)

اور جو سود تم لوگوں کے اموال میں افزائش کے لیے دیتے ہو وہ اللہ کے نزدیک افزائش نہیں پاتا اور جو زکوٰۃ تم اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے دیتے ہو پس ایسے لوگ ہی (اپنا مال) دوچند کرنے والے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ مَآ اٰتَیۡتُمۡ مِّنۡ رِّبًا: اپنے کاروبار میں سہولت اور دولت میں اضافہ کے لیے بااثر لوگوں کو تم جو تحائف پیش کرتے ہو ان سے سرمائے میں اضافہ نہیں ہوتا۔ سرمائے میں اضافے کی بہتر صورت یہ ہے تم اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔ اس سے تمہاری دولت بڑھے گی۔

اگر اس آیت کو مکی تسلیم کیا جائے تو ربا سے مراد یہاں اصطلاحی سود نہیں جو حرام ہے بلکہ ہر قسم کا اضافہ مراد ہے۔ نہ ہی زکوٰۃ سے اصطلاحی زکوٰۃ مراد ہے بلکہ ہر قسم کا صدقہ مراد ہے لیکن اگر ان آیات کو مدنی تسلیم کیا جائے تو سود سے وہی حرام سود مراد ہو سکتا ہے اور زکوٰۃ سے اصطلاحی زکوۃ۔

فرض

وَ مَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً ؕ فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِى الدِّيْنِ وَ لِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ﴿سورہ توبہ آیت ۱۲۲﴾

اور یہ تو ہو نہیں سکتا کہ سب کے سب مومنین نکل کھڑے ہوں، پھر کیوں نہ ہر گروہ میں سے ایک جماعت نکلے تاکہ وہ دین کی سمجھ پیدا

کریں اور جب اپنی قوم کی طرف واپس آئیں تو انہیں تنبیہ کریں تاکہ وہ (ہلاکت خیز باتوں سے) بچے رہیں۔

تشریح کلمات

لِيَنْفِرُوْا:نَفَرَ (ن ف ر) اگر مِنْ اور عَنْ کے ساتھ نفر منہ او عنہ تو دوری اور متفرق ہونے کے معنی میں ہے اور اگر اِلَی کے ساتھ نَفَر الیہ تو نکلنے اور روانہ ہونے کے معنی میں ہے۔

كَآفَّةً:(ک ف ف) سب کے سب اور تمام کے معنی میں ہے۔

لولا:اس آیت میں یہ لفظ تشویق و ترغیب کے لیے ہے۔

لِّيَتَفَقَّهُوْا:الفقہ (ف ق ہ) العلم بالشئ کسی چیز پر علم اور فہم کے معنی میں ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً: سب مؤمنین پر نکلنا واجب نہیں ہے۔ اس کی دو تفسیریں ہیں :

الف: یہ جہاد سے مربوط ہے کہ تمام مؤمنین پر جہاد کے لیے نکلنا واجب نہیں ہے بلکہ ہر گروہ اور قبیلے سے ایک جماعت جہاد پر نکلنے کی بجائے دینی تعلیم کے لیے نکلے۔ اس صورت میں دینی تعلیم حاصل کرنے والوں پر دوران تعلیم جہاد واجب نہیں ہے۔

ب: یہ آیت دینی تعلیم کے لیے ایک دستور ہے کہ یہ تو ہو نہیں سکتا سب مؤمنین دینی تعلیم کے لیے نکلیں۔ ایسا کرنے سے نظام زندگی درہم برہم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا کیوں نہ ان کے ہر گروہ اور قبیلے سے ایک جماعت علمی مراکز کی طرف سفر کرے کہ دینی تعلیم حاصل کر کے واپس آئے اور اپنی قوم کو تعلیم دے۔

جہاد اور تعلیم کے لیے ایک تعبیر نفر استعمال کرنے سے اس بات کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ تعلیم بھی جہالت کے خلاف ایک جہاد ہے نیز اس بات کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ حصول تعلیم کے لیے وطن سے دور جانا پڑے تو جانا ہو گا۔

۲۔ فَلَوْ لَا نَفَرَ: لو لا چونکہ تشویق اور ترغیب کے لیے ہے لہٰذا اس سے طلب علم کے لیے نکلنا واجب ثابت ہوتا ہے۔ جیسے

لَوْ لَا تَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (۲۷ نمل : ۴۶)تم اللہ سے مغفرت کیوں طلب نہیں کرتے ہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

یعنی استغفار کرو تم پر رحم کیا جائے گا۔ البتہ علم کے لیے نکلنا واجب کفائی ہے کہ کچھ لوگوں کے انجام دینے سے باقی سے ساقط ہو جاتا ہے۔

۳۔ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِى الدِّيْنِ: تاکہ وہ دین میں سمجھ حاصل کریں۔ دین کی سمجھ حاصل کرنا تو سب پر واجب ہے لیکن تعلیم کے لیے سفر کرنا سب کے لیے ممکن نہیں ہے تو ایک جماعت یہ فریضہ انجام دے اور سفر کر کے دینی تعلیم حاصل کرے، واپس آنے پر دوسروں کو دینی تعلیم دے اور دوسروں پر واجب ہے کہ وہ ان سے دینی تعلیم حاصل کریں۔

الفقہ قرآنی اصطلاح میں مطلق سمجھ اور فہم کے لیے استعمال ہوتا ہے:

قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ (۶ انعام: ۹۸)ہم نے سمجھنے والوں کے لیے نشانیاں تفصیل کے ساتھ بیان کی ہیں۔

لہٰذا اس آیت میں اصول و فروع، حلال و حرام پر مشتمل تمام دینی تعلیمات کی فہم مراد ہے۔ بعد میں

فقہاء کی اصطلاح میں فقہ کا لفظ حلال و حرام کے لیے مختص ہو گیا۔

۴۔ وَ لِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ: دینی سمجھ حاصل کرنے والوں پر واجب ہے کہ وہ اپنی قوم، جس معاشرے میں وہ رہتے ہیں ، کے لیے دینی احکام بیان کریں۔ یہاں لِيُنْذِرُوْا میں انذار (تنبیہ) کا لفظ استعمال ہوا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ جن احکام کو یہ لوگ بیان کریں گے ان پر عمل کرنا واجب ہے ورنہ انذار (تنبیہ) بے سود ہو گی۔

۵۔ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ: تاکہ وہ بچے رہیں ، سے بھی واضح ہوتا ہے کہ ان کے بیان کردہ احکام پر عمل کرنا واجب ہے۔

اہم نکات

۱۔ دینی تعلیم حاصل کرنے والی جماعت پوری قوم کی طرف سے واجب کفائی بجا لا رہی ہوتی ہے: فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ ....

۲۔ ہر قوم کو اس کے علاقے میں دینی تعلیم کی سہولت میسر آنی چاہیے: لِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ ....

وَ مَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴿سورہ انبیاء آیت ۷﴾

اور ہم نے آپ سے پہلے بھی مردان (حق) ہی کی طرف وحی بھیجی ہے، اگر تم لوگ نہیں جانتے ہو تو اہل ذکر سے پوچھ لو۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ مَآ اَرۡسَلۡنَا قَبۡلَکَ اِلَّا رِجَالًا: تاریخ انبیاء میں کسی غیر انسان کو اللہ نے نبوت کے درجہ پر فائز نہیں فرمایا۔ انبیاء علیہم السلام بھی رجال، انسان ہیں مگر ان کا امتیاز یہ ہے:

۲۔ نُّوۡحِیۡۤ اِلَیۡہِمۡ: ان پر اللہ کی طرف سے وحی ہوتی ہے۔ جس وجود کو لوگ انسانوں کی طرح سمجھتے ہیں وہ اور ہے، وہ انسانوں میں سے ایک انسان ہے لیکن جس وجود پر وحی ہوتی ہے وہ عام انسانوں کی طرح نہیں ہے۔

۳۔ فَسۡـَٔلُوۡۤا اَہۡلَ الذِّکۡرِ: اگر تم نہیں جانتے ہو کہ انبیاء انسانوں میں سے مبعوث ہوتے رہے ہیں تو اَہۡلَ الذِّکۡرِ سے پوچھ لو۔ الذِّکۡرِ سے مراد کتب سماوی ہیں اور اَہۡلَ الذِّکۡرِ ان کتابوں کا علم رکھنے والے اہل کتاب ہیں۔ چونکہ مشرکین اور اہل کتاب دونوں رسول اللہؐ کے خلاف تھے اور اہل کتاب

مشرکین کی حمایت کرتے تھے تو یہاں ان سے کہا گیا: خود تمہاری حمایت کرنے والے اہل کتاب سے پوچھ لو کہ ان کے انبیاء رجال تھے یا فرشتے؟

اَہۡلَ الذِّکۡرِ: حضرت امام باقر علیہ السلام سے زرارہ نے روایت کی ہے کہ آپ ؑنے فرمایا: ہم اَہۡلَ الذِّکۡرِ ہیں۔ یہی روایت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے بھی منقول ہے۔ ملاحظہ ہو: محمد بن مسلم کی روایت تفسیر طبری ۱۴:۶۹، تفسیر ابن کثیر ۲:۵۷، حافظ ابن مؤمن کی تفسیر جو بارہ تفاسیر کا خلاصہ ہے، روح المعانی ۱۴:۱۳۴ میں۔

تفسیر اور شان نزول: قرآن کی تفسیر اور شان نزول کے بارے میں یہ بات ہر قاری کے ذہن میں ہونی چاہیے کہ قرآن صرف شان نزول میں محدود نہیں ہے بلکہ قرآن اپنے لفظی اور تعبیری دائرے

میں شان نزول سے وسیع تر ہے۔ چنانچہ اصول تفسیر میں ایک جملہ مشہور ہے:

العبرة بعموم اللفظ لا بخصوص السبب ۔لفظ کے عموم کو اعتبار حاصل ہے، سبب نزول کی خصوصیت کو نہیں۔

اس آیت میں نزول کے اعتبار سے یہ بات ناممکن ہے کہ منکرین رسالت سے کہا جائے: اہل بیت رسول سے پوچھ لو۔ وہ خود رسول کو نہیں مانتے اہل بیت کو کیسے مان سکتے ہیں لیکن تعبیر کے عموم میں مسلمان بھی شامل ہیں کہ کوئی بات اگر تم نہیں جانتے تو اہل ذکر سے پوچھو۔ قرآن کے ذکرہونے میں کسی کو کلام نہیں ہے:

اِنۡ ہُوَ اِلَّا ذِکۡرٌ وَّ قُرۡاٰنٌ مُّبِیۡنٌ (۳۶ یٰس: ۶۹)یہ تو بس ایک نصیحت (کی کتاب) اور روشن قرآن ہے۔

اسی طرح اہل بیت علیہم السلام کے عالم قرآن ہونے کی وجہ سے اہل ذکر ان پر صادق آتا ہے۔ اسی طرح اہل بیت علیہم السلام کے رُتبے کا کوئی بھی عالم بالقرآن ہو، وہ بھی اس کا مصداق بن سکتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اہل بیت علیہم السلام کے رتبے کا کوئی عالم بالقرآن نہیں ہے۔

مرض

فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ ؕ فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَآ اَسَرُّوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ ﴿سورہ مایدہ آیت ۵۲﴾

پس آپ دیکھتے ہیں کہ جن کے دلوں میں بیماری ہے وہ ان میں دوڑ دھوپ کرتے ہیں اور کہتے ہیں: ہمیں اس بات کا خوف ہے کہ کہیں ہم پر

کوئی گردش نہ آ پڑے، پس قریب ہے کہ اللہ فتح دے یا اپنی طرف سے کوئی اور بات ظاہر کرے پھر یہ لوگ اپنے اندر چھپائے ہوئے نفاق پر نادم ہوں گے۔

تفسیر آیات

یہ بات تقریباً مسلم ہے کہ سورہ مائدہ سال حجۃ الوداع میں فتح مکہ کے بعد نازل ہوا، لہٰذا اس آیت میں جس فتح کا ذکر ہے وہ کوئی اور فیصلہ کن فتح ہے۔ مکہ میں نازل ہونے والی آیات اور مدنی زندگی کے اوائل میں بھی یہود و نصاریٰ کا ذکر نہیں آتا، کیونکہ اس زمانے میں یہود و نصاریٰ کے ساتھ واسطہ نہیں پڑتا تھا۔ مدنی زندگی کے آخری نصف حصے میں فتح مکہ کے بعد اگرچہ اسلام ایک طاقت بن کر ابھرا تھا، تاہم مدینہ اور اطراف مدینہ کے یہود و نصاریٰ اسلا م کے خلاف سازشوں میں اپنی قوت کو مجتمع کر رہے تھے۔ اس وقت اسلام دشمن طاقتیں تین گروہ میں منقسم تھیں: ایک گروہ نے رسول اسلامؐ سے مصالحت

کر لی تھی۔ دوسرا گروہ اسلام کے ساتھ برسر جنگ تھا اورتیسرا گروہ نہ صلح، نہ جنگ، بلکہ انتظار میں تھا کہ فیصلہ کن فتح کس کی ہو گی؟ ان میں سے کچھ لوگ کفر کا ہی اظہار کرتے تھے اور کچھ منافق لوگ بظاہر اسلام کا اظہار کرتے تھے اور اندر سے وہ یہود و نصاریٰ کے ساتھ بھی مربوط تھے تاکہ اگر اسلام شکست سے دوچار ہو جائے تو جائے پناہ مل جائے۔

۱۔ فَتَرَی الَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ: یہ مریض قلب لوگ منافقین بھی ہو سکتے اور منافقین کے علاوہ بھی ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ سورہ انفال آیت ۴۹ میں فرمایا:

اِذۡ یَقُوۡلُ الۡمُنٰفِقُوۡنَ وَ الَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ مَّرَضٌ ...جب (ادھر) منافقین اور جن کے دلوں میں بیماری تھی، کہ رہے تھے....

یہ اس وقت کی بات ہے جب اسلام کفر کے ساتھ برسر پیکار تھا۔

۲۔ یَقُوۡلُوۡنَ نَخۡشٰۤی: ان کے دل میں ایمان نہ ہونے کی وجہ سے وہ مضطرب تھے۔اسلام کی فتح پر ان کا ایمان نہ تھا۔ ہر وقت یہ کھٹکا لگا رہتا تھاکہ مسلمانوں کو شکست ہو جائے اور یہود غالب آ جائیں تو ہمارا کیا بنے گا؟ جبکہ امر واقع یہ ہو رہا تھا کہ فتح اسلام کی ہو رہی ہے اور یہود شکست سے دوچار ہو رہے ہیں۔

۳۔ فَعَسَی اللّٰہُ اَنۡ یَّاۡتِیَ بِالۡفَتۡحِ: اب یہ کمزور ایمان یا منافق لوگ جس گردش سے فرار کر رہے تھے، اسی میں جا پھنسے۔ اب ندامت کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ ممکن ہے فتح سے مراد اسلام کی فیصلہ کن کامیابی ہو اور ممکن ہے فتح خیبر اور

دیگر علاقوں کی فتح ہو۔ ان کے نزدیک اسلام و کفر میں سے فتح کسی ایک کی ہو سکتی تھی۔

۴۔ اَوۡ اَمۡرٍ مِّنۡ عِنۡدِہٖ: یا کوئی اور بات، سے کیا مراد ہے؟ بعض کے نزدیک منافقین کے نفاق کا فاش ہونا ہے۔ بعض کے نزدیک یہود کی جلا وطنی اور مدینہ سے بے دخلی ہے۔ بعض کے نزدیک جزیہ کی خواری ہے۔

۵۔ فَیُصۡبِحُوۡا عَلٰی مَاۤ اَسَرُّوۡا فِیۡۤ اَنۡفُسِہِمۡ نٰدِمِیۡنَ: جس نفاق کو ان لوگوں نے چھپایا تھا، آج اسلام کی کامیابی سے وہ ندامت میں مبتلا ہیں۔ واضح رہے اصبح کے معنی ہیں ہمیشہ صبح میں داخل ہو گے، یا صبح کا وقت نہیں ہوتا بلکہ اصبح، صار کے معنوں میں زیادہ آتا ہے۔

اہم نکات

۱۔دل کی بیماری شک و تردد ہے۔ جب کہ دل کی صحت ایمان و یقین ہے۔

۲۔جن کے دلوں میں ایمان و ایقان نہ ہو، وہ ہمیشہ گردش ایام کے خوف سے مضطرب الحال رہتے ہیں۔

۳۔اللہ پر تکیہ اور توکل نہ ہو تو انجام ندامت کے سوا کچھ نہ ہو گا۔

مشورہ

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَ لَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۪ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَ اسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَ شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ﴿سورہ آل عمران آیت ۱۵۹﴾

(اے رسول) یہ مہر الٰہی ہے کہ آپ ان کے لیے نرم مزاج واقع ہوئے اور اگر آپ تندخو اور سنگدل ہوتے تو یہ لوگ آپ کے پاس سے منتشر ہو جاتے، پس ان سے درگزر کریں اور ان کے لیے مغفرت طلب کریں اور معاملات میں ان سے مشورہ کر لیا کریں پھر جب آپ عزم کر لیں تو اللہ پر بھروسہ کریں، بے شک اللہ بھروسہ کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

تشریح کلمات

فَظًّا:(ف ظ ظ) بد مزاج۔

غَلِيْظَ:(غ ل ظ) موٹا اور گاڑھا، جو اجسام کا وصف ہوتا ہے لیکن بطور استعارہ معافی اور سخت مزاجی کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

انْفَضُّوْا:(ف ض ض) الفض ۔ کسی چیز کو توڑنا اور ریزہ ریزہ کرنا۔ بطور استعارہ متفرق

اور منتشر ہونے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

شَاوِرۡ:(ش و ر) شرت العسل ۔ چھتے سے تازہ شہد نکالنا۔ اسی مناسبت سے ذہنی چھتے سے رائے اخذ کرنے کو مشورہ کہا جاتا ہے۔

تفسیرآیات

۱۔ فَبِمَا رَحۡمَۃٍ مِّنَ اللّٰہِ لِنۡتَ لَہُمۡ: اس جنگ میں سب سے زیادہ صدمہ رسول اللہ (ص) کو پہنچا۔ دشمن سے جنگ کے بارے میں مدینے میں اختلاف شروع ہوا۔ ایک تہائی لشکر راستے سے واپس چلا گیا۔ ایک گروہ نے غنیمت کے لالچ میں رسول(ص) کی نافرمانی کی۔حضرت حمزہ ؑ و دیگر شہداء کی قربانی دینا پڑی۔ حضور (ص) کے دندان مبارک شہید ہوئے۔ چند افراد کے علاوہ باقی مسلمان آپ (ص) کو میدان جنگ میں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ انہو ں نے آپ ؐ کی آواز پر بھی لبیک نہیں کہا اور پلٹ کر دیکھا تک نہیں۔ آپ (ص) کے قتل کی خبر سن کر دین سے برگشتہ ہوگئے اور

آبائی دین اختیار کرنے کی باتیں کرنے لگے، وغیرہ وغیرہ۔ ان تمام باتوں کے باوجود حضور (ص) کا رویہ نرم رہا اور آپ (ص) نے خدائی اخلاق کا مظاہرہ فرمایا۔رحمت الٰہی کا مظاہرہ ہوا اور تمام گستاخیوں کے باوجود نہ کسی کو راندۂ درگاہ کیا، نہ کسی کی ایسی سرزنش کی کہ وہ آپ (ص) سے متنفر ہو جائے۔

۲۔ وَ لَوْ کُنْتَ فَظًّا غَلِیْظَ الْقَلْبِ: اگر اپنے ساتھیوں کی ان ناشائستہ حربی جرائم پر سرزنش کرتے، اپنے حسن خلق کا مظاہرہ نہ کرتے تو وہ آپؐ کو چھوڑ جاتے۔ اس سے یہ بات سمجھ میں آ جاتی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حربی جرائم سے در گزر فرماتے تھے جو دنیا میں قابل معانی نہیں ہوتے تو دوسری لغزشوں بلکہ سازشوں سے درگزر فرمانا تعجب کی بات نہیں ہے۔ چنانچہ جنگ تبوک سے واپسی کے

موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شہید کرنے کی سازش کو فاش نہیں فرمایا۔

۳۔ خلق عظیم کے اس مظاہرے کے باوجود مزید حکم ہو رہا ہے: فَاعْفُ عَنْہُمْ یعنی ان سے درگزر کریں اور ان کی لغزشوں پر کوئی اثرمترتب نہ کریں۔ ان کے اس عظیم گناہ کے لیے دعائے مغفرت کریں۔

۴۔ وَ شَاوِرْہُمْ فِی الْاَمْرِ: معاملات میں بدستور ان سے مشاورت کریں اور سابقہ روش میں تبدیلی نہ لائیں جیساکہ احد کی جنگ سے پہلے آپ (ص)نے لوگوں سے مشورہ فرمایا تھا۔

ولایت و مشاورت: رسول اللہ (ص) بحیثیت رسول احکام شرع میں کسی سے مشورہ نہیں فرماتے بلکہ احکام شرع تابع وحی ہوتے ہیں۔

لیکن بحیثیت حاکم اور ولی الامر، تدبیر امور اور مقام نفاذ و اجرا، انتظامی اور عملی میدانوں میں رسول اللہ (ص) کو مشورہ کی سنت قائم کرنے کا حکم ہے۔ قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ یہ حکم
اسلامی قیادت کو مل رہا ہے کہ اپنے امور مملکت کے نفاذ کی کیا صورت ہونی چاہیے۔ اس پر باہمی مشورہ کرو۔ اس باہمی مشورے میں خود مسئلہ ’’ قیادت‘‘ شامل نہیں، نہ خود ’’ امر‘‘ شامل ہے بلکہ قیادت اور امر کا تعین اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔

۵۔ فَاِذَا عَزَمۡتَ: مشورے کے بعد فیصلہ، عزم اور نفاذ، اسلامی قیادت کو کرنا ہے۔

اہم نکات

۱۔ سخت مزاجی لوگونکو داعیان حق سے دور کر دیتی ہے اور نرم مزاجی انہیں نزدیک رکھتی ہے۔

۲۔ توکل، ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھنے کا نام نہیں بلکہ مستحکم ارادے اور جہد مسلسل کے ساتھ نتائج کو اللہ پر چھوڑ نا توکل کہلاتا ہے: فَاِذَا عَزَمۡتَ فَتَوَکَّلۡ ....

۳۔ مشورے کی صورت میں بھی فیصلہ اسلامی قیادت کو ہی کرنا ہے: فَاِذَا عَزَمۡتَ ...

وَ الَّذِیۡنَ یَجۡتَنِبُوۡنَ کَبٰٓئِرَ الۡاِثۡمِ وَ الۡفَوَاحِشَ وَ اِذَا مَا غَضِبُوۡا ہُمۡ یَغۡفِرُوۡنَ ﴿سورہ شورہ آیت ۳۷﴾اور جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کی باتوں سے پرہیز کرتے ہیں اور جب انہیں غصہ آئے تو معاف کر دیتے ہیں۔

وَ الَّذِیۡنَ اسۡتَجَابُوۡا لِرَبِّہِمۡ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ ۪ وَ اَمۡرُہُمۡ شُوۡرٰی بَیۡنَہُمۡ ۪ وَ مِمَّا رَزَقۡنٰہُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ ﴿سورہ شورہ آیت ۳۸﴾

اور جو اپنے پروردگار کو لبیک کہتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور اپنے معاملات باہمی مشاورت سے انجام دیتے ہیں اور ہم نے جو رزق انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

وَ الَّذِیۡنَ اِذَاۤ اَصَابَہُمُ الۡبَغۡیُ ہُمۡ یَنۡتَصِرُوۡنَ﴿۳۹﴾۔ اور جب ان پر زیادتی سے ظلم کیا جاتا ہے تو وہ اس کا بدلہ لیتے ہیں۔

تفسیر آیات

وَ مَا عِنۡدَ اللّٰہِ خَیۡرٌ وَّ اَبۡقٰی: جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ بہتر و دائمی ہے ان لوگوں کے لیے جن میں یہ اوصاف موجود ہوں:

i ایمان، ii۔ توکل، iii۔ بڑے گناہوں اور بے حیائی
iv سے اجتناب، v۔ غصے کی صورت میں معاف،
vi اپنے رب کی ہر دعوت پر لبیک، vii نماز قائم کرنا،
viii۔ اپنے معاملات میں مشورہ، ix۔ انفاق،
ظلم سے انکاری۔

۱۔ وَ الَّذِیۡنَ یَجۡتَنِبُوۡنَ کَبٰٓئِرَ الۡاِثۡمِ: یہ دائمی ثواب ان لوگوں کے لیے ہے جو ایمان اور توکل بر خدا کے بعد گناہانِ کبیرہ سے اجتناب کرتے ہیں۔ گناہان کبیرہ کی تعریف کیا ہے؟ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سورہ نساء آیت ۳۱۔

۲۔ وَ الۡفَوَاحِشَ: فحش گناہوں سے بچتے ہیں۔ وَ الۡفَوَاحِشَ کے بارے میں ایک روایت میں حضرت علی علیہ السلام نے زنا، شراب نوشی اور ربا خواری کو وَ الۡفَوَاحِشَ میں شمار فرمایا ہے۔ (مستدرک الوسائل ۴:۹۴)

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

الْفَوَاحِشُ الزِّنَا وَ السَّرِقَۃُ۔ (وسائل الشیعۃ ۱۵: ۳۲۳)زنا، چوری فواحش ہیں۔

قرآن کی دیگر آیات میں الْفَوَاحِشَ کی تعریف ملتی ہے:

وَ لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰۤی اِنَّہٗ کَانَ فَاحِشَۃً ؕ وَ سَآءَ سَبِیۡلًا (۱۷ بنی اسرائیل : ۳۲)اور زنا کے قریب بھی نہ جاؤ، یقینا یہ بڑی بے حیائی ہے اور بہت برا راستہ ہے۔

وَ لُوۡطًا اِذۡ قَالَ لِقَوۡمِہٖۤ اَتَاۡتُوۡنَ الۡفَاحِشَۃَ وَ اَنۡتُمۡ تُبۡصِرُوۡنَ (۲۷ نمل: ۵۴)اور لوط (کا وہ وقت یاد کرو) جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا: کیا تم بدکاری کا ارتکاب کرتے ہو؟ حالانکہ تم دیکھ رہے ہوتے ہو۔

ان آیات میں فواحش میں زنا لواط اور باپ کی منکوحہ سے نکاح کرنا شامل ہیں۔

۳۔ وَ اِذَا مَا غَضِبُوْا: غصہ آئے تو معاف کر دیتے ہیں۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے:

مَنْ مَلَکَ نَفْسَہُ اِذَا رَغِبَ وَ اِذَا رَہِبَ وَ اِذَا اشْتَھَی وَ اِذَا غَضِبَ وَ اِذَا رَضِیَ حَرَّمَ اللّٰہُ جَسَدَہُ عَلَی النَّارِ۔ (الفقیہ ۴: ۴۰۰)جو شخص رغبت، خواہشات، خوف، غصے اور خوشی کے وقت اپنے آپ کو قابو میں رکھتا ہے اس کے جسم کو اللہ جہنم کی آگ پر حرام کر دیتا ہے۔

روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا گیا لوگوں میں بہتر کون ہے؟ فرمایا:

الذَّیْنَ اِذَا اَحْسَنُوا اسْتَبْشَرُوا وَ اِذَا اَسَاءُ وا اسْتَغْفَرُوا وَ اِذَا اُعْطُوا شَکَرُوا وَ اِذَا ابْتُلُوا صَبَرُوا وَ اِذَا غَضِبُوا غَفَرُوا۔ (الوسائل ۱: ۱۰۶)وہ لوگ ہیں کہ جب احسان کریں تو خوش ہو جائیں جب کوئی برا کام صادر ہو جائے تو استغفار کریں جب کوئی چیز مل جائے تو شکر کریں جب کسی مصیبت میں مبتلا ہو جائیں تو صبر کریں جب غصہ آئے تو معاف کریں۔

۴۔ وَ الَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّہِمْ: اللہ کے پاس جو ثواب ہیں وہ ان لوگوں کے لیے ہیں جو اللہ کے ہر حکم پر لبیک کہتے ہیں۔ حکم الٰہی قبول اور اس پر عمل کرنے میں کسی قسم کے لیت و لعل سے کام نہیں لیتے۔ منجملہ نماز کا قائم کرنا ہے۔

۵۔ وَ اَمْرُہُمْ شُوْرٰی بَیْنَہُمْ: اجتماعی امور میں دوسروں کے تجربات اور بہت سی عقلوں سے

فائدہ اٹھانے کا نام مشورہ ہے۔ حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے:

لاَ ظَهِيرَ كَالْمُشَاوَرَةِ۔ (الوسائل ۱۲: ۴۰)باہمی مشاورت جیسی کوئی پشت پناہ نہیں۔

مشورہ ان امور میں لیا جاتا ہے جو بقول مولانا شبیر احمد عثمانی قرآن و سنت میں منصوص نہ ہوں۔ جو چیز منصوص ہو اس میں رائے و مشورہ کی گنجائش نہیں ہے اور غیر معقول ہو گا کہ خدا و رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کوئی حکم دیں اور لوگ مشورے سے اس کے خلاف فیصلہ دیں۔

اَمْرُہُمْ: ''اپنے معاملات'' سے معلوم ہوا کہ مشاورت ان اجتماعی امور سے متعلق ہے جو شریعت سے متصادم نہیں ہیں اور جو قرآن و سنت میں منصوص ہے وہ اَمْرُہُمْ نہیں ہو گا بلکہ امر

من اللہ ہو گا۔ چنانچہ سورہ احزاب آیت ۳۶ میں ارشاد فرمایا:

وَ مَا کَانَ لِمُؤۡمِنٍ وَّ لَا مُؤۡمِنَۃٍ اِذَا قَضَی اللّٰہُ وَ رَسُوۡلُہٗۤ اَمۡرًا اَنۡ یَّکُوۡنَ لَہُمُ الۡخِیَرَۃُ مِنۡ اَمۡرِہِمۡ۔۔۔۔اور کسی مؤمن اور مومنہ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ جب اللہ اور اس کے رسول کسی معاملے میں فیصلہ کریں تو انہیں اپنے معاملے کا اختیار حاصل رہے۔

۶۔ وَ مِمَّا رَزَقۡنٰہُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ: راہ خدامیں اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔ مالی واجبات ادا کرتے ہیں۔

۷۔ وَ الَّذِیۡنَ اِذَاۤ اَصَابَہُمُ الۡبَغۡیُ: مومن ظالم اور جابر کے مقابلے میں چٹان کی طرح مضبوط ہوتا ہے۔ وہ کسی جابر سے دبتا ہے نہ کسی ظالم کے سامنے ہتھیار ڈالتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے وہ غالب آنے پر مغلوب اور کمزور آدمی کی غلطیوں سے درگزر کرتا ہے اور ندامت کا اظہار کرنے

والے کی معذرت قبول کرتا ہے لیکن اگر ظالم اور جابر قابل عفو نہیں ہے تو اس سے صرف انتقام لیتا ہے اور اس پر زیادتی نہیں کرتا۔ آنے والی چند آیتوں میں انتقام کے اصول و ضوابط کا ذکر ہے:

اُذِنَ لِلَّذِیۡنَ یُقٰتَلُوۡنَ بِاَنَّہُمۡ ظُلِمُوۡا ؕ وَ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصۡرِہِمۡ لَقَدِیۡرُ ۙ (۲۲حج: ۳۹)جن لوگوں پر جنگ مسلط کی جائے انہیں (جنگ کی) اجازت دی گئی ہے کیونکہ وہ مظلوم واقع ہوئے اور اللہ ان کی مددکرنے پر یقینا قدرت رکھتا ہے۔

چونکہ ظلم و زیادتی کا دفاع قابل ستائش عمل ہے۔ دفاع ممکن ہونے کے باوجود ظالم اور سرکش کو ظلم کرنے کی اجازت دینا مذموم ہے۔

تحفہ

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَ اَنْتُمْ حُرُمٌ ؕ وَ مَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ هَدْيًۢا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا لِّيَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِهٖ ؕ عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ ؕ وَ مَنْ عَادَ فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ ؕ وَ اللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ﴿سورہ مائدہ آیت ۹۵﴾

اے ایمان والو! احرام کی حالت میں شکار نہ کرو اور اگر تم میں سے کوئی جان بوجھ کر (کوئی جانور) مار دے تو جو جانور اس نے مارا ہے اس کے برابر ایک جانور مویشیوں میں سے قربان کرے جس کا فیصلہ تم میں سے دو عادل افراد کریں، یہ قربانی کعبہ پہنچائی جائے یا مسکینوں کو کھانا کھلانے کا کفارہ دے یا اس کے برابر روزے رکھے تاکہ اپنے کیے کا ذائقہ چکھے، جو ہو چکا اسے اللہ نے معاف کر دیا اور اگر کسی نے اس غلطی کا اعادہ کیا تو اللہ اس سے انتقام

لے گا اور اللہ بڑا غالب آنے والا ، انتقام لینے والا ہے۔

تشریح کلمات

الۡکَعۡبَۃِ:(ک ع ب) اصل میں ہر اس مقام کو کہتے ہیں جو ٹخنے کی شکل پر چکور بنا ہوا ہو۔ اس لیے بیت الحرام کے خانہ خدا کو کعبہ کہتے ہیں۔ (راغب)

حُرُمٌ:(ح ر م) جس سے روک دیا گیا ہو اس کو ’’حرام‘‘ کہتے ہیں۔ مطلوبہ چیزیں جس سے رد کر دی گئی ہوں اس کو ’’ محروم ‘‘ کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ لَا تَقۡتُلُوا الصَّیۡدَ: حج کے احرام کی حالت میں خشکی کے جانوروں کا شکار کرنا حرام ہے، اگر یہ شکار مُّتَعَمِّدًا جان بوجھ کر ہو۔

۲۔ فَجَزَآءٌ مِّثۡلُ مَا قَتَلَ: اگر کوئی جان بوجھ کر خشکی کے جانور کا شکار کرے تو اس کا کفارہ

یہ ہے کہ جس جانور کا شکار کیا گیا ہے، اس کی مثل یعنی اس جیسا جانور کفارے میں دیا جائے۔

۳۔ يَحۡكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدۡلٍ مِّنۡكُمۡ: دو عادل افراد اس کا فیصلہ کریں کہ کون سا جانور اس کی مثل ہے۔

۴۔ هَدۡيًۢا بٰلِغَ الۡكَعۡبَةِ: یہ کفارہ کعبہ کی سرزمین میں قربانی کی شکل میں انجام دینا چاہیے۔ فقہ جعفری کے مطابق اگر یہ شکار حج کے احرام میں کیا گیا ہے تو اس کا کفارہ منی میں اور اگر عمرہ کے احرام میں ہو تو مکہ میں ذبح ہونا چاہیے۔

آیت کا نزول عمرہ کے بارے میں ہے یا الۡكَعۡبَةِ سے مراد ارض کعبہ ہے، جس میں منی بھی شامل ہے، لہٰذا یہ حکم قرآن کے خلاف نہیں ہے۔

۵۔ اَوۡ کَفَّارَۃٌ طَعَامُ مَسٰکِیۡنَ: یا مسکنیوں کو کھانا کھلایا جائے۔ فقہ جعفری کے مطابق شکار شدہ جانور کی مثل کی قیمت کا طعام کھلایا جائے گا۔

۶۔ اَوۡ عَدۡلُ ذٰلِکَ صِیَامًا: یا اس کے برابر روزے رکھے۔ برابر سے مراد یہ ہے کہ اس جانور کی مثل کی قیمت میں جس قدر طعام بنتا ہے اس میں ہر ایک مد (۷۵۰ گرام گندم جو وغیرہ) یا دو مد کے مقابلے میں ایک دن روزہ رکھا جائے۔

۷۔ لِّیَذُوۡقَ وَبَالَ اَمۡرِہٖ: تاکہ اپنے عمل کے وبال کا ذائقہ چکھے اور جرم کی حرمت کی خلاف ورزی کی سزا بھگتے۔ کیا یہ کفارات ترتیبی ہیں؟ یعنی پہلا ممکن نہ ہونے کی صورت میں دوسرا، یہ بھی ممکن نہ ہونے کی صورت میں تیسرا ہے یا شروع سے ان میں سے جس کو چاہے اختیار کرے؟ فقہی مسائل کی کتابوں میں مذکور ہے۔

۸۔ عَفَا اللّٰہُ عَمَّا سَلَفَ: اس حکم کے نزول سے پہلے جو شکار ہوئے ہیں، ان کا کفارہ نہیں ہے۔ ان کو اللہ نے معاف فرمایا ہے۔

۹۔ وَ مَنۡ عَادَ فَیَنۡتَقِمُ اللّٰہُ مِنۡہُ: شکار پہلی بار کیا ہو تو اس کا کفارہ ہے۔ دوبارہ اعادہ کیا تو گناہ شدید ہونے کی وجہ سے کفارہ نہیں ہے۔

لَنۡ یَّنَالَ اللّٰہَ لُحُوۡمُہَا وَ لَا دِمَآؤُہَا وَ لٰکِنۡ یَّنَالُہُ التَّقۡوٰی مِنۡکُمۡ ؕ کَذٰلِکَ سَخَّرَہَا لَکُمۡ لِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ہَدٰىکُمۡ ؕ وَ بَشِّرِ الۡمُحۡسِنِیۡنَ﴿سورہ حج آیت ۳۷﴾

نہ اس کا گوشت اللہ کو پہنچتا ہے اور نہ اس کا خون بلکہ اس تک تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے، اسی طرح اللہ نے انہیں تمہارے لیے مسخر کیا ہے تاکہ

اللہ کی عطا کردہ ہدایت پر تم اس کی بڑائی کا اظہار کرو اور (اے رسول) آپ نیکی کرنے والوں کو بشارت دیں ۔

تفسیر آیات

۱۔ لَنۡ یَّنَالَ اللّٰہَ لُحُوۡمُہَا: جاہلیت میں یہ رواج تھا کہ وہ قربانی کے گوشت کو کعبہ کے پاس لا کر رکھتے اور قربانی کے خون کو کعبہ کی دیواروں پر ملتے تھے۔ اس طرح وہ خیال کرتے تھے کہ ایسا کرنے سے یہ گوشت اور خون اللہ کو پہنچ جاتا ہے۔ اس جاہلانہ توہم کو دور کرتے ہوئے فرمایا: ان جانوروں کا گوشت اور خون اللہ کو نہیں پہنچتا، نہ اللہ ان چیزوں کا محتاج ہے۔

۲۔ وَ لٰکِنۡ یَّنَالُہُ التَّقۡوٰی: باین معنی کہ تقویٰ کے ساتھ انجام پانے والے اعمال اللہ تک پہنچتے ہیں اور اللہ کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے۔ قربانی پیش کرنے کا اصل محرک ایثار ہے اور ایثار تقویٰ ہے۔

اللہ کے پاس وہ عمل پہنچتا ہے جو تقویٰ و پرہیزگاری کے ساتھ انجام پایا ہو۔ تقویٰ یعنی جو عمل محرمات سے بچا کر بجا لایا جاتا ہے وہ اللہ تک پہنچ جاتا ہے، اسے اللہ وصول یعنی قبول فرماتا ہے۔ اِنَّمَا یَتَقَبَّلُ اللّٰہُ مِنَ الۡمُتَّقِیۡنَ ۔ (۵ مائدہ: ۲۷۹) اللہ صرف تقویٰ والوں کا عمل قبول فرماتا ہے۔ تقویٰ کے بغیر کا مطلب یہ ہو گا کہ اس عمل کی انجام دہی میں تقویٰ یعنی محرمات سے بچاؤ اور پرہیز نہیں ہے۔

۳۔ کَذٰلِکَ سَخَّرَہَا لَکُمۡ: یہ قربانی تمہارے اختیار میں دی گئی تھی۔ اس الٰہی اکرام کے شکرانے میں قربانی پیش کرنا تقویٰ ہے۔

۴۔ لِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ہَدٰىکُمۡ: تاکہ تم اس تسخیر کے شکرانے اور اس ہدایت کی قدردانی کے طور پر اللہ کی کبریائی کا اظہار کرو۔

۵۔ وَ بَشِّرِ الْمُحْسِنِیْنَ: تقویٰ کا مالک ہی نیکی کے درجے پر فائز ہو سکتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ قربانی تقویٰ کی بنیاد پر قبول ہوتی ہے۔

۲۔ قربانی دیتے ہوئے اللہ کی کبریائی کا اظہار ہونا چاہیے۔

دعوت

وَ اَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ﴿سورہ شعراء آیت ۲۱۴﴾

اور اپنے قریب ترین رشتے داروں کو تنبیہ کیجیے۔

تشریح کلمات

عشیرۃ:عشیرۃ الرجل قرابتہ: عشیرۃ سے مراد قریبی رشتے دار ہیں چونکہ قریبی رشتہ دار باہم معاشرت کرتے ہیں اس لیے عشیرہ کہا گیا ہے۔

تفسیر آیات

انبیا علیہم السلام تبلیغ و ارشاد کا سلسلہ اپنے قرابتداروں سے شروع فرماتے ہیں۔ الْاَقْرَبِیْنَ میں بنی ہاشم اور بنی عبد المطلب شامل ہیں۔ (جلالین)

الْاَقْرَبِیْنَ قریبی ترین رشتہ داروں سے دعوت کی ابتدا اس لیے بھی ہو رہی ہے کہ رسولؐ کی حیات میں یہی لوگ سب سے زیادہ رسولؐ کے حامی ہوں گے اور رسولؐ کی حیات کے بعد تبلیغ کا بوجھ اٹھانے والے یہی ہوں گے۔

نیز دعوت اپنے قریبی ترین رشتہ داروں سے شروع کرنے میں یہ راز بھی ہے کہ اگر قریبی لوگوں کو چھوڑ کر دوسرے لوگوں کو دعوت دیتے تو ذہنوں میں ایک سوال اٹھ سکتا تھا کہ اپنے قریبی رشتہ دار چونکہ محمدؐ کو قریب سے جانتے ہیں، اگر یہ دعوت حق پر مبنی ہوتی تو رشتہ داروں کو پہلے دعوت دینا چاہیے تھا۔ رسول اللہؐ کی دعوت یا خود رسول اللہ ؐ میں کوئی کمزوری ہوتی تو قریب سے جاننے والوں سے پرہیز کرتے۔

الْاَقْرَبِیْنَ: قریبی ترین رشتہ دار۔ بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب قریبی ترین شامل ہیں جیسا کہ لفظ عشیرۃ کی تاکید اور مزید وضاحت کے لیے اقربین فرمایا۔

لہٰذا وہ روایات جن میں کہا ہے کہ رسول اللہؐ نے قریش کے تمام قبائل کو بلایا۔ قرآنی صراحت کے خلاف ہے۔ ساتھ ان روایات میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس دعوت کے موقع پر تَبَّتۡ یَدَاۤ اَبِیۡ لَہَبٍ وَّ تَبَّ ﴿﴾ (۱۱۱ اللھب:۱) نازل ہوئی ہے اس کے مطابق لازم آتا ہے سورہ شعراء، سورہ تبت سے پہلے نازل ہوا ہو جب کہ ترتیب نزول میں سورہ تبت چھٹا سورہ ہے اور سورہ شعراء ۴۷ واں سورہ ہے۔

شان نزول: عبد اللہ بن عباس حضرت علی علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ آپؑ نے فرمایا:

جب رسول اللہؐ پر آیہ وَ اَنۡذِرۡ عَشِیۡرَتَکَ الۡاَقۡرَبِیۡنَ نازل ہوئی تو رسول اللہؐ نے مجھے بلایا فرمایا:

یا علی! اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں قریبی ترین رشتہ داروں کی تنبیہ کروں۔ اس حکم سے میرا دل تنگ ہو گیا۔ مجھے علم تھا کہ میں جب یہ کام شروع کروں گا تو ان کا رد عمل نامناسب ہو گا۔ میں نے خاموشی اختیار کی تو جبرئیل نازل ہوئے اور کہا:

اے محمد! اگر آپ نے یہ کام نہ کیا تو اللہ آپ کو عذاب میں مبتلا کرے گا۔

لہٰذا اے علی! ایک صاع کھانا تیار کرو۔ ایک بھیڑ کی ران اور ایک پیالہ دودھ سے بھر دو۔ پھر عبدالمطلب کے خاندان کے افراد کو جمع کرو کہ میں ان سے بات کروں اور جس چیز کا مجھے حکم ملا ہے وہ ان تک پہنچا دوں۔

میں نے حکم کی تعمیل کی اور سب کو بلایا جو چالیس افراد بنتے تھے۔ ایک کم یا زیادہ ہو سکتا ہے۔ ان میں ان کے چچا عباس، حمزہ، ابوطالب، ابولہب شامل تھے۔ جب یہ سب لوگ جمع ہو گئے تو مجھ سے کھانا پیش کرنے کے لیے فرمایا۔ جب میں نے پیش کیا تو رسول اللہ ؐ نے گوشت کا ایک ٹکڑا لیا اور اپنے دانتوں سے اس کو چیرا پھر اسے برتنوں کے کناروں پر ڈال دیا پھر فرمایا:

لے لو بسم اللہ ۔

چنانچہ سب نے کھایا اور سب سیر ہو گئے۔ جب کہ اس اللہ کی قسم! جس کے قبضے میں علی کی جان ہے جو کھانا میں نے پیش کیا تھا وہ ان کا ایک آدمی کھا سکتا تھا۔ پھر فرمایا:

ان کو پلاؤ۔

پھر میں نے وہ پیالہ پیش کیا تو سب نے پیا اور سب سیراب ہو گئے جب کہ قسم بخدا ان کا ایک آدمی یہ سارا پی سکتا تھا۔ رسول اللہ ؐ نے بات شروع کرنا چاہی تو ابولہب نے پہل کی اور کہا:

تمہارے اس ساتھی نے تو پہلے بھی ایسے جادو کیے ہیں۔

جس سے لوگ متفرق ہو گئے۔ دوسرے دن رسول اللہؐ نے فرمایا:

اے علی! اس شخص نے پہل کی۔ میرے بات کرنے سے پہلے لوگ متفرق ہو گئے۔ تم پہلے کی طرح ان کے لیے کھانا تیار کرو۔

میں نے ایسا کیا اورسب کو جمع کیا۔ گذشتہ کل کی طرح کھانا پیش کیا۔ سب نے سیر ہو کر کھایا اور سیراب ہو کر پیا۔

پھر رسول اللہ نے بات شروع کی۔ فرمایا:

اے عبد المطلب کی اولاد! میں کسی عرب جوان کونہیں جانتا جو اپنی قوم کی طرف اس چیز سے بہتر لے کر آیا ہو جو میں لے کر آیا ہوں۔ میں تمہارے پاس دنیا و آخرت دونوں کی بھلائی لے کر آیا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں آپ لوگوں کو اسی بھلائی کی طرف دعوت دوں۔

آپ میں سے کون ہے جو اس سلسلے میں میرا ہاتھ بٹائے کہ وہ میرا بھائی، میرا وصی اور تمہارے درمیان میرا خلیفہ بن جائے۔

سب رک گئے میں نے کہا:

حالانکہ میں ان سب میں کم سن، آشوب چشم والا، ابھرے شکم والا، نازک پنڈلی والاتھا۔ یا نبی اللہ! میں آپ کا ہاتھ بٹانے والا ہوں گا۔

رسول اللہؐ نے میری گردن پر ہاتھ رکھ کر فرمایا:

ان ھذا اخی و وصیی و خلیفتی فیکم فاسمعوا لہ واطیعوا ۔یہ میرا بھائی، میرا وصی اور تمہارے درمیان میرا خلیفہ ہے۔ اس کی بات سنو اور اطاعت کرو۔

اس پر لوگ ہنستے ہوئے کھڑے ہوئے اور ابوطالب سے کہا:

تجھے اپنے بیٹے کی بات سننے اور اطاعت کرنے کا حکم دیا ہے۔

یہ حدیث درج بالا الفاظ کے ساتھ طبری نے اپنی تاریخ، تاریخ الامم و الملوک ۲: ۳۱۹ میں اور ابوجعفر اسکافی نے نقض العثمانیۃ ۳۰۳ میں روایت کی ہے اور کہا ہے:

انہ روی فی الخبر الصحیح ۔

اور شہاب الدین خفاجی نے شرح الشفا ۳: ۳۵ میں نقل کیا ہے اور آخر میں کہا ہے:

و قد ذکر دلائل البیھقی وغیرہ بسند صحیح ۔

۲۔ دوسرے الفاظ میں یہ حدیث اس طرح آئی ہے:

فایکم یبایعنی علی ان یکون اخی وصاحبی و وارثی
۔تم میں کون ہے جومیری اس بات پر بیعت کرے
کہ وہ میرا بھائی، میرا ساتھی اور میرے وارث ہو۔
تین بار ان جملوں کی تکرار فرمائی۔ آخر میں علی
کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

ان الفاظ میں امام احمد بن حنبل نے اپنی مسند ۲:
۳۵۷ میں روایت کی ہے اور اس روایت کے تمام
راوی ثقہ ہیں۔ امام نسائی نے الخصائص اور
السنن الکبری ۵:۱۲۵ میں روایت کی ہے۔ ملاحظہ
ہو الغدیر ۲: ۳۹۹۔

۳۔ تیسرے الفاظ میں یہ حدیث اس طرح آئی ہے:

من یبایعنی علی ان یکون اخی و صاحبی و ولیکم بعدی۔ فمددت یدی و قلت انا ابایعک ۔کون میرے ہاتھ اس بات پر بیعت کرے گا کہ وہ میرا بھائی، میرا ساتھی اور میرے بعد تمہارا ولی ہو تو میں نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور کہا: میں آپ کی بیعت کرتا ہوں۔

ان الفاظ کے ساتھ روایت کی ہے حافظ ابن مردویہ نے جس کا سیوطی نے جمع الجوامع میں ذکر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو کنز العمال ۱۳: ۱۷۴

۴۔ چوتھے الفاظ میں یہ حدیث اس طرح منقول ہے:

فقال اجلس فانت اخی و وزیری و وصیی و وارثی و خلیفتی من بعدی ۔فرمایا: علی بیٹھ جاؤ۔ تو میرا بھائی، میرا وزیر، میرا وصی، میرا وارث اور میرے بعد میرا خلیفہ ہے۔

حافظ ابو حاتم اور حافظ بغوی نے ان الفاظ میں راویت کی ہے۔ ملاحظہ ہو السیرۃ الحلبیۃ ۱: ۲۸۶

۵۔ پانچویں الفاظ میں یہ حدیث اس طرح منقول ہے۔

ثم قال: من یواخینی و یوازرنی و یکون ولیی و وصیی بعدی و خلیفتی فی اہلی یقضی دینی ۔پھر فرمایا: کون میرا بھائی اور وزیر ہو گا کہ میرے بعد میرا ولی اور وصی اور میرے اہل بیت میں میرا خلیفہ بن جائے اور میرا قرض ادا کرے۔

الکشف والبیان ثعلبی ۷: ۱۸۲ نے یہ روایت بیان کی ہے۔ ملاحظہ ہو کفایۃ الطالب گنجی صفحہ ۲۰۴۔

مصر کے مقتدر ادیب اور شاعر عبدالمسیح انطاکی نے اپنے اشعار میں اس واقعہ کو نظم کیا ہے۔ آخر میں کہتے ہیں:

کذاک حیدرة ماشی النبوة مذ

وشارک المصطفی من یوم ان وضع الا

نادی بہا المصطفی لبی منادیھا

ساس حتی انتہت علیا مبانیھا

اس طرح حیدر نبوت کے ساتھ چلتے رہے۔ جب بھی مصطفی نے ندا دی آپ نے لبیک کہا۔ جس دن محمد مصطفی نے اس دین کی بنیاد رکھی ہے اس

دن سے لے کر اس عمارت کی تکمیل تک آپ مصطفی کے شریک رہے۔

حدیث کی تحریف: طبری نے یہ حدیث اپنی تاریخ میں مکمل بیان کی ہے لیکن اپنی تفسیر میں اس حدیث میں تحریف کر ڈالی۔ چنانچہ علی ان یکون اخی و وصیی وخلیفتی فیکم کے الفاظ میں سے وصیی و خلیفتی فیکم کی جگہ وکذا وکذا لکھ دیا۔ حدیث کے آخر میں بھی ان ھذا اخی کے بعد وصی اور خلیفتی کی جگہ وکذا وکذا لکھ دیا۔

ابن کثیر اپنے مصادر میں تاریخ طبری کو سر فہرست رکھتے ہیں لیکن اس حدیث کی نقل میں تاریخ طبری کی جگہ تفسیر طبری کی تحریف شدہ روایت انہیں زیادہ پسند آئی اور اپنی تاریخ البدایۃ والنہایۃ ۳: ۵۳ میں اور تفسیر میں وصیی وخلیفتی کی جگہ وکذا وکذا لکھ دیا۔

آیت میں تحریف: صحیح مسلم میں ابن عباس سے روایت ہے کہ یہ آیت اس طرح نازل ہوئی:

وانذر عشیرتک الاقربین و رھطک منہم المخلصین ۔ کہتے ہیں پھر نسخ ہو گئی۔

شاید آیت پہلے نازل ہوئی پھر اس کی تلاوت منسوخ ہو گئی پھر اس کا ایک حصہ سورہ شعراء میں دوبارہ نازل ہوا ہے۔ (التحریر والتنویر ۱۹: ۲۰۵)

تفسیر قرطبی میں کہا ہے:

و ظاہر ھذا انہ کان قرانا یتلی و انہ نسخ ۔اس سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ (و رھطک منہم

المخلصین) قرآن کا حصہ تھا اور تلاوت بھی ہوتی تھی جو بعد میں نسخ ہو گیا۔

اس قسم کی روایات کے تحت اس قسم کی عبارتوں کو اہل سنت کے علماء قرآن کا حصہ تسلیم کرتے ہیں۔ پھر نظریہ نسخ تلاوت کے ذریعہ منسوخ فرض کرتے ہیں۔

ہم نے مقدمہ میں وضاحت سے لکھا ہے کہ اس قسم کی روایات میں اہل تشیع اور اہل سنت کے موقف میں بنیادی فرق یہ رہا ہے کہ شیعہ ایسی روایات کے تحت اس قسم کی عبارتوں کو قرآن کا حصہ نہیں سمجھتے اور ان عبارتوں کو قرآن تسلیم کرنے سے پہلے توجیہ تاویل یا مسترد کرتے ہیں۔ اہل سنت ایسی عبارتوں کو قرآن کا حصہ تسلیم کرنے کے بعد ایک متنازعہ نظریے کے تحت منسوخ سمجھتے ہیں۔ وہ متنازعہ نظریہ نسخ تلاوت ہے۔ پہلے بھی ذکر ہو چکا نسخ تلاوت

ایک مفروضہ ہے، اس پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ نسخ تلاوت ثابت نہ ہونے کی صورت میں اس قسم کی عبارتیں قرآن کا حصہ رہتی ہیں۔ اس سے تحریف قرآن لازم آتی ہے۔

ایک اعتراض اور اس کا جواب

اعتراض: کیا ایک نابالغ بچے کو وصی، وارث اور خلیفہ بنایا جاتا ہے؟ کیا بزرگوں کو دعوت دینے کے لیے ایک بچے سے کام لیا جاتا ہے؟ کیا رسول اللہ ایک بچے کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر اس سے بیعت لے سکتے ہیں ؟

جواب: کیا حضرت علی علیہ السلام غیر مکلف، غیر عاقل تھے؟ تو کیا رسول اللہؐ نے ایک غیر مکلف اور غیر عاقل کو ایمان کی دعوت دی؟ کیا رسول اللہؐ نے علی علیہ السلام کے ایمان کو قبول

نہیں کیا؟ اگر دعوت دی ہے توکیا یہ دعوت بحکم خدا تھی یا ذاتی خواہش پر؟

چونکہ رسول اللہ ؐ نے علی علیہ السلام کے علاوہ کسی بچے کو اسلام کی دعوت نہیں دی لہٰذا علی علیہ السلام حضرت آدم علیہ السلام کی طرح ہیں کہ وجود میں آنے کے فوراً بعد ایمان لے آئے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح کہ ابھی ایک دن کے تھے، اپنی نبوت کا اعلان کیا اور حضرت یحییٰ علیہ السلام کی طرح ہیں جنہیں طفولیت میں حکمت دے دی گئی اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرح ہیں جو گیارہ سال کی عمر میں حضرت داود علیہ السلام کے جانشین ہوئے۔

شکر

اِنَّ اِبۡرٰہِیۡمَ کَانَ اُمَّۃً قَانِتًا لِّلّٰہِ حَنِیۡفًا ؕ وَ لَمۡ یَکُ مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ﴿سورہ نحل آیت ۱۲۰﴾

ابراہیم (اپنی ذات میں) ایک امت تھے اللہ کے فرمانبردار اور (اللہ کی طرف) یکسو ہونے والے تھے اور وہ مشرکین میں سے نہ تھے۔

شَاکِرًا لِّاَنۡعُمِہٖ ؕ اِجۡتَبٰہُ وَ ہَدٰىہُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ﴿سورہ نحل آیت ۱۲۱﴾

(وہ) اللہ کی نعمتوں کے شکر گزار تھے، اللہ نے انہیں برگزیدہ کیا اور صراط مستقیم کی طرف ان کی ہدایت کی۔

وَ اٰتَیۡنٰہُ فِی الدُّنۡیَا حَسَنَۃً ؕ وَ اِنَّہٗ فِی الۡاٰخِرَۃِ لَمِنَ الصّٰلِحِیۡنَ﴿۱۲۲﴾ؕ۱۲۲۔ اور ہم نے دنیا میں انہیں بھلائی دی اور آخرت میں وہ صالحین میں سے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کفر کے مقابلے میں ایک امت کی طرح تھے۔ ایک امت کی طرح قیام

کیا۔ ایک امت کی طرح طاقتور رہے۔ ایک امت کی طرح طاغوت وقت کا مقابلہ کیا۔ ایک امت کی طرح طاغوت پر فتح حاصل کی اور ایک امت کی طرح انسانیت کی تاریخ کا رخ بدلا۔

۲۔ قَانِتًا لِّلّٰہِ: وہ اللہ کے فرماں بردار تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ طاقت اللہ کی اطاعت اور طاقت کے سرچشمہ سے گہرے ربط کی وجہ سے ملی۔

۳۔ حَنِیۡفًا: یکسو ہونے والا۔ وہ تمام غیر اللہ سے منقطع ہو کر یکسوئی کے ساتھ صرف اللہ کی طرف متوجہ رہتے اور اسی پر تکیہ کرتے تھے۔ غیر اللہ سے منقطع ہونے کی صورت میں ہی اللہ پر کامل بھروسہ ہو سکتا ہے اور اگر کوئی غیر اللہ پر بھروسہ کرتا ہے تو اللہ اس کو اسی غیر اللہ پر چھوڑ دیتا ہے۔

۴۔ وَ لَمۡ یَکُ مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ: ابراہیم علیہ السلام کے عقائد اور کردار میں ، شریک اور غیر اللہ کی طرف توجہ کرنے کا شائبہ تک نہ تھا۔

۵۔ شَاکِرًا لِّاَنۡعُمِہٖ: اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے والے تھے۔ مقام شکر پر فائز ہونا حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسے خلیل الرحمٰن کے لیے اہم ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شکر نعمت قولاً و عملاً کس قدر عند اللہ قابل قدر عمل ہے۔

درج بالا اوصاف کا حامل ہونے پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو درج ذیل عنایتوں سے نوازا:

۔ اِجۡتَبٰہُ: ان کو برگزیدہ کیا۔i

ii- ہَدٰىہُ: ان کی صراط مستقیم کی راہنمائی کی۔

iii وَ اٰتَیۡنٰہُ فِی الدُّنۡیَا حَسَنَۃً: دنیا میں بھی ان کو حسنات سے نوازا اور آخرت میں بھی۔

اس سے معلوم ہوا کہ نیک اعمال کے اثرات اس زندگی پر بھی مترتب ہوتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ عبادت اور انقطاع الی اللہ سے ابراہیمؑ کو ایک امت کا درجہ ملا۔

رَبَّنَاۤ اِنِّیۡۤ اَسۡکَنۡتُ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ بِوَادٍ غَیۡرِ ذِیۡ زَرۡعٍ عِنۡدَ بَیۡتِکَ الۡمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِیُقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ فَاجۡعَلۡ اَفۡئِدَۃً مِّنَ النَّاسِ تَہۡوِیۡۤ اِلَیۡہِمۡ وَارۡزُقۡہُمۡ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّہُمۡ یَشۡکُرُوۡنَ﴿سورہ ابراھیم آیت ۳۷﴾

اے ہمارے پروردگار! میں نے اپنی اولاد میں سے بعض کو تیرے محترم گھر کے نزدیک ایک بنجر وادی میں بسایا، اے ہمارے پروردگار! تاکہ یہ نماز قائم کریں لہٰذا تو کچھ لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کر دے اور انہیں پھلوں کا رزق عطا فرما تاکہ یہ شکرگزار بنیں۔

تفسیر آیات

۱۔ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ: میں لفظ مِنْ تبعیضی ہے۔ اس سے ’’ بعض اولاد‘‘ سمجھا جاتا ہے جس سے مراد حضرت اسماعیل (ع) اور ان کی اولاد ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل (ع) اور ان کی اولاد کو یہاں بسایا تھا۔

۲۔ عِنۡدَ بَیۡتِکَ الۡمُحَرَّمِ: بیت سے مراد کعبہ ہے جو اس وقت بَیۡت یعنی گھر کی شکل میں آ گیا تھا۔ اس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ یہ دعا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی عمر کے آخری حصے

میں بیت اللہ کی تعمیر کے وقت مانگی ہے کیونکہ حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق علیہما السلام آپ (ع) کے عالم پیری میں پیدا ہوئے ہیں:

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡ وَہَبَ لِیۡ عَلَی الۡکِبَرِ اِسۡمٰعِیۡلَ وَ اِسۡحٰقَ ---- (۱۴ ابراہیم: ۳۹)ثنائے کامل ہے اس اللہ کے لیے جس نے عالم پیری میں مجھے اسماعیل اور اسحق عنایت کیے---

اور بیت اللہ کی تعمیر حضرت اسماعیل علیہ السلام کی جوانی کے وقت عمل میں آئی:

وَ اِذۡ یَرۡفَعُ اِبۡرٰہٖمُ الۡقَوَاعِدَ مِنَ الۡبَیۡتِ وَ اِسۡمٰعِیۡلُ ---- (۲ بقرۃ: ۱۲۷)اور (وہ وقت یاد کرو) جب ابراہیم و اسماعیل اس گھر کی بنیادیں اٹھا رہے تھے----

۳۔ رَبَّنَا لِیُقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ: یہ وادی پتھریلی اور ریتلی ہونے کی وجہ سے آج تک قابل زراعت نہیں ہے۔ یہاں اپنی اولاد کو حضرت ابراہیم علیہ السلام

نے اس لیے بسایا کہ وہ نماز قائم کریں۔ کیا نماز قائم کرنے کے لیے بے آب و گیاہ خشک بیابان کی ضرورت تھی؟ حضرت علی علیہ السلام اس کا جواب ارشاد فرماتے ہیں کہ اس گھر کو سخت چٹانوں اور گہری ریت کے درمیان کیوں قرار دیا؟

وَلَکِنَّ اللهَ یَخْتَبِرُ عِبَادَهُ بِاَنْوَاعِ الشَّدَائِدِ وَ یَتَعَبَّدَهَمْ بِاَنْوَاعِ الْمُجَاہِدِ وَ یَبْتَلِیْهِمْ بَضُرُوبِ المَکَارِہِ، اِخْراجاً لِلتَّکَبُّرِ مِنْ قُلُوبِہِمْ وَ اِسْکَاناً لِلتَّذَلُّلِ فِی نُفُوسِہِم ---- (نہج البلاغۃ ص ۲۹۲۔ خطبہ قاصعہ)لیکن اللہ سبحانہ اپنے بندوں کو گوناگوں سختیوں سے آزماتا ہے اور ان سے ایسی عبادت کا خواہاں ہے کہ جو طرح طرح کی مشقتوں سے سے بجا لائی گئی ہو اور انہیں قسم قسم کی ناگواریوں سے جانچتا ہے تاکہ ان کے دلوں سے تکبر کو نکال باہر کرے اور ان کے نفوس میں عجز و فروتنی کو جگہ دے----

۴۔ فَاجۡعَلۡ اَفۡئِدَۃً مِّنَ النَّاسِ تَہۡوِیۡۤ اِلَیۡہِمۡ: لہٰذا تو لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل بنا دے۔
فاجعل میں فا برائے تفریع ہے۔جیسے ہم اردو میں ایک مطلب بیان کرنے کے بعد نتیجے کا ذکر کرنا چاہتے ہیں تو ’’ لہٰذا ‘‘ کہتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام فرماتے ہیں : میں نے اپنی ذریت کو تیرے گھر کے پاس بسایا ہے تاکہ یہ نماز قائم کریں لہٰذا صلہ کے طور پر لوگوں کے دلوں کو ان کا مشتاق بنا دے۔ اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ سے لوگوں کے دلوں میں اپنی اولاد کی محبت کی درخواست کر رہے ہیں۔

اس جگہ ہم آپ کے لیے تفہیم القرآن کی عین عبارت لکھ دیتے ہیں جو انہوں نے آیۃ المودۃ کے اہل بیت اطہار (ع) کی شان میں ہونے کو بڑی شدّومد سے رد کرتے ہوئے لکھی ہے:

تیسری بات جو ان سب سے زیادہ اہم ہے وہ یہ ہے کہ ایک نبی جس بلند مقام پر کھڑا ہو کر دعوت الی اللہ کی پکار بلند کرتا ہے، اس مقام سے اس کار عظیم پر یہ اجر مانگنا تم میرے رشتہ داروں سے محبت کرو، اتنی گری ہوئی بات ہے کہ کوئی صاحب ذوق سلیم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ (تفہیم القرآن ۴: ۵۰۳)

صاحب تفہیم القرآن کا ذوق اس قدر سلیم ہے کہ حضرت ابراہیم خلیل (ع) کا ذوق سقیم معلوم ہوتا ہے جو اپنے کارنامے کے صلے میں اولاد کی محبت مانگتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی اولاد کی ہر دلعزیزی چاہتے تھے: فَاجۡعَلۡ اَفۡئِدَۃً مِّنَ النَّاسِ ....

۲۔ مادی ناداری میں اللہ کی بندگی کی دارائی مل جاتی ہے: وَارۡ زُقۡہُمۡ مِّنَ الثَّمَرٰتِ ...

رزق

وَ مَاۤ اَرۡسَلۡنَا فِیۡ قَرۡیَۃٍ مِّنۡ نَّذِیۡرٍ اِلَّا قَالَ مُتۡرَفُوۡہَاۤ ۙ اِنَّا بِمَاۤ اُرۡسِلۡتُمۡ بِہٖ کٰفِرُوۡنَ﴿سورہ سبأ آیت ۳۴﴾

اور ہم نے کسی بستی کی طرف کسی تنبیہ کرنے والے کو نہیں بھیجا مگر یہ کہ وہاں کے مراعات یافتہ لوگ کہتے تھے: جو پیغام تم لے کر آئے ہو ہم اسے نہیں مانتے۔
وَ قَالُوۡا نَحۡنُ اَکۡثَرُ اَمۡوَالًا وَّ اَوۡلَادًا ۙ وَّ مَا نَحۡنُ بِمُعَذَّبِیۡنَ﴿سورہ سبأ آیت ۳۵﴾

اور کہتے تھے: ہم اموال اور اولاد میں بڑھ کر ہیں ہم پر عذاب نہیں ہو گا۔

تشریح کلمات

مترف:(ت ر ف) التُّرفۃ عیش و عشرت میں فراخی اور وسعت کو کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ مَآ اَرۡسَلۡنَا فِیۡ قَرۡیَۃٍ مِّنۡ نَّذِیۡرٍ: خوشحالی اور ناز و نعمت کی فراوانی سے قدریں بدل جاتی ہیں اور دلوں کو زنگ لگ جاتا ہے۔ دولت انسان کو بے نیازی کے غلط احساس میں مبتلا کر دیتی ہے:

کَلَّاۤ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَیَطۡغٰۤی اَنۡ رَّاٰہُ اسۡتَغۡنٰی ﴿۷﴾ (۹۶علق: ۶۔۷)ہرگز نہیں! انسان تو یقینا سر کشی کرتا ہے۔ اس بنا پر کہ وہ اپنے آپ کو بے نیاز خیال کرتا ہے۔

پھر انبیاء علیہم السلام کی دعوت اور اس مراعات یافتہ طبقے کے مفادات میں ٹکراؤ ہے۔انبیاء علیہم السلام مال کو وسیلہ سمجھتے ہیں اور یہ لوگ مال کو منزل سمجھتے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام عدل و انصاف کی دعوت دیتے ہیں۔ یہ لوگ استحصال کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں۔ پھر مال کے سیاہ پردوں کے پیچھے دل تک حق کی آواز نہیں پہنچ پاتی۔

قرآن نے اس بات کو ایک کلی امر کے طور پر بیان فرمایا ہے کہ جب بھی اور جہاں بھی ہم نے کسی بستی میں رسول بھیجا، وہاں مراعات یافتہ اور نازپروروں نے اس رسول کو قبول کرنے سے انکار کیا۔ سورۂ زخرف کی آیت ۲۳ میں بھی اسی مطلب کو ایک کلیہ کے طور پر بیان فرمایا ہے:

وَ كَذٰلِكَ مَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ فِیۡ قَرۡیَۃٍ مِّنۡ نَّذِیۡرٍ اِلَّا قَالَ مُتۡرَفُوۡہَاۤ ۙ اِنَّا وَجَدۡنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰۤی اُمَّۃٍ وَّ اِنَّا عَلٰۤی اٰثٰرِہِمۡ مُّقۡتَدُوۡنَ﴿۲۳﴾اور اسی طرح ہم نے آپ سے پہلے کسی بستی کی طرف کوئی تنبیہ کرنے والا نہیں بھیجا مگر یہ کہ وہاں کے عیش پرستوں نے کہا: ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک رسم پر پایا اور ہم انہی کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔

۲۔ وَ قَالُوۡا نَحۡنُ اَکۡثَرُ اَمۡوَالًا: دولت کے نشے میں مدہوش یہ لوگ کہتے ہیں: ہمارے پاس چونکہ مال و اولاد کی فراوانی ہے، یہ اس بات کی علامت ہے کہ اللہ ہم سے راضی ہے اور جب اللہ کی خوشنودی ہمارے ساتھ ہے تو اللہ ہمیں عذاب نہیں دے گا۔

وَّ مَاۤ اَظُنُّ السَّاعَۃَ قَآئِمَۃً ۙ وَّ لَئِنۡ رُّدِدۡتُّ اِلٰی رَبِّیۡ لَاَجِدَنَّ خَیۡرًا مِّنۡہَا مُنۡقَلَبًا﴿۳۶﴾ (۱۸ کہف: ۳۶)اور میں خیال نہیں کرتا کہ قیامت آنے والی ہے اور اگر مجھے

میرے رب کے حضور پلٹا دیا گیا تو میں ضرور اس سے بھی اچھی جگہ پاوں گا۔

اہم نکات

۱۔ دولت کے سیاہ پردوں کے پیچھے موجود دل تک حق کی آواز نہیں پہنچتی۔

۲۔ دولت مند ہمیشہ داعیان حق کے مخالف ہوتے ہیں۔

قُلۡ اِنَّ رَبِّیۡ یَبۡسُطُ الرِّزۡقَ لِمَنۡ یَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِہٖ وَ یَقۡدِرُ لَہٗ ؕ وَ مَاۤ اَنۡفَقۡتُمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ فَہُوَ یُخۡلِفُہٗ ۚ وَ ہُوَ خَیۡرُ الرّٰزِقِیۡنَ﴿سورہ سبأ آیت ۳۹﴾

کہدیجئے: میرا رب اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے فراوانی اور تنگی سے رزق دیتا ہے اور جو کچھ تم خرچ کرتے ہو اس کی جگہ وہ اور دیتا ہے اور وہ سب سے بہتر رزق دینے والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ قُلۡ اِنَّ رَبِّیۡ یَبۡسُطُ الرِّزۡقَ: اس جملے کی تشریح اسی سورہ کی آیت ۳۶ میں ہو چکی ہے۔

۲۔ وَ مَاۤ اَنۡفَقۡتُمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ فَہُوَ یُخۡلِفُہٗ: جو تم راہ خدا میں خرچ کرتے ہو اس کی جگہ وہ اور دیتا ہے۔ دنیا میں نعمت کی فراوانی اور آخرت میں ثواب کی صورت میں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے:

اَنْفِقْ اَنْفَقُ عَلَیْکَ۔ (تفسیر قرطبی ذیل آیت۔ تفسیرمجمع البیان ذیل آیت۔)تو دے دے، میں تجھے دے دوں گا۔

دوسری حدیث میں آیا ہے کہ ایک فرشتہ ہر رات ندا دیتا ہے:

اللّٰھم ھب للمنفق خلفا۔ (مجمع البیان ذیل آیت)اے اللہ! خرچ کرنے والوں کو اس کی جگہ اور دے دے۔

حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

اِذَا اَمْلَقْتُمْ فَتَاجِرُوا اللہَ بِالصَّدَقَۃِ۔ (نہج البلاغۃ کلمات قصار : ۲۵۸)اگر تنگدست ہو جاؤ تو صدقہ دے کر اللہ سے سودا کرو۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حدیث ہے:

مَنْ اَیْقَنْ بِالْخَلَفِ سَخَتْ نَفْسُہُ بِالنَّفَقَۃِ۔ (الکافی ۴:۴۳)جو مزید ملنے پریقین رکھتا ہے وہ خرچ کرنے میں سخاوت سے کام لیتا ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے:

وَ مَا اَنْفَقَ الرَّجُلُ مِنْ نَفَقَۃٍ فَعَلَی اللہِ خَلْفُھَا ضَمَاناً۔۔۔ (مستدرک الوسائل ۱۵: ۲۶۷۔ مجمع البیان ذیل آیہ)مرد جو بھی خرچ کرتا ہے تو اللہ ضامن ہے اس کی جگہ اور دینے کا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث قابل توجہ ہے:

کل معروف صدقۃ و ما انفق الرجل علی نفسہ واھلہ کتب لہ صدقۃ وما وقی بہ الرجل عرضہ فھو صدقۃ و ما انفق الرجل من نفقۃ فعلی اللہ خلفھا الا ما کان من نفقۃ فی بنیان او معصیۃ۔ (تفسیر قرطبی ذیل

آیت)ہر نیکی صدقہ ہے۔ انسان اپنی ذات، اپنے اہل و عیال پر جو خرچ کرتا ہے وہ صدقہ ہے اور جس مال سے انسان اپنی عزت، وقار محفوظ کر لیتا ہے وہ بھی صدقہ ہے۔ انسان جو بھی خرچ کرتا ہے اللہ کے ذمے ہے اس کی جگہ اور دینا مگر یہ کہ (غیر ضروری) عمارت پر یا گناہ پر خرچ کیا ہو۔

توجہ رہے کہ اگر کوئی شخص نیکی کی راہ میں مال خرچ کرتا ہے مگر اس سے اس کے مال میں اضافہ نہیں ہوتا ہے تو سمجھ لے اس کے مال کے حلال ہونے مینشبہ ہے ورنہ اللہ نے اس کی جگہ مزید دینے کی ضمانت دی ہے۔

اہم نکات

۱۔بہترین سودا وہ ہے جو صدقہ کی صورت میں اللہ کے ساتھ ہو۔

صبر

وَ اسۡتَعِیۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَ الصَّلٰوۃِ ؕ وَ اِنَّہَا لَکَبِیۡرَۃٌ اِلَّا عَلَی الۡخٰشِعِیۡنَ ﴿ۙ سورہ بقرہ آیت ۴۵﴾

اور صبر اور نماز کا سہارا لو اور یہ (نماز) بارگراں ہے، مگر خشوع رکھنے والوں پر نہیں۔

الَّذِیۡنَ یَظُنُّوۡنَ اَنَّہُمۡ مُّلٰقُوۡا رَبِّہِمۡ وَ اَنَّہُمۡ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ﴿٪۴۶﴾۴۶۔ جنہیں اس بات کا خیال رہتا ہے کہ انہیں اپنے رب سے ملنا ہے اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے ۔

تشریح کلمات

اسۡتَعِیۡنُوۡا: (ع و ن) استعانت۔ مدد لینا۔

الصَّبۡرِ:(ص ب ر) مشقت کے باوجود باز رہنا۔ شرعی اصطلاح میں اپنے نفس کو عقل اور شریعت کے تقاضوں کے مطابق قابو میں رکھنا۔

خشوع:(خ ش ع) فروتنی، عاجزی۔ اکثر کے نزدیک بیرونی اعضا و جوارح کی فروتنی خشوع کہلاتی ہے۔ یاد رہے کہ خشوع جب دل میں ہو گا تو اعضائے ظاہری میں ضرور نمایاں ہو گا۔

یَظُنُّوْنَ:(ظ ن ن) ظن،گمان یعنی کسی خبر کے مثبت اور منفی پہلوؤں میں سے کسی ایک کو ترجیح دینا جب کہ دوسری طرف کا احتمال باقی ہو۔ اگر دوسری طرف کا احتمال باقی نہ رہے تو اسے علم اور یقین کہتے ہیں۔ یہ لفظ کبھی یقین کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے: وَّ ظَنَّ اَنَّہُ الْفِرَاقُ ۔ {۷۵ قیامۃ : ۲۸ ۔ اور وہ سمجھ جائے گا کہ اس کی جدائی کا لمحہ آ گیا ہے ۔}

رجوع:(ر ج ع)اپنی سابقہ حالت کی طرف پلٹنا۔

تفسیرآیات

استعانت کے حکم سے د و تصور سامنے آتے ہیں:

۱۔ انسان ہمیشہ دشمن کے حملے کی زد میں ہے۔

۲۔ انسان بذات خود کمزور اور ناتواں ہے۔

صبر،عاجزی اور بے بسی نہیں بلکہ مشکلات اور شدائد کا مقابلہ کرنے کی ایک معنوی اور روحانی طاقت کا نام ہے۔ اسلام روزے اور دوسرے احکام کے ذریعے صبر کی تربیت دیتا ہے۔ بعض مفسرین نے صبر سے مراد روزہ لیا ہے۔ لیکن صبر صرف روزے میں منحصر نہیں،بلکہ روزہ تو صبر کے مصادیق میں سے ایک مصداق اور اس کے تربیتی مراحل میں سے ایک مرحلہ ہے۔

علل و اسباب کی دنیا میں انسان کو گونا گوں حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کبھی اسے کامیابی حاصل ہوتی ہے اورکبھی ناکامی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ چنانچہ وہ فطری طو رپر کامیابی کے

وقت خوش اور ناکامی کی صورت میں غمگین ہوتا ہے۔

لیکن اگر انسان مضبوط شخصیت کا مالک ہو تو وہ خوشی کی حالت میں آپے سے باہر نہیں ہوتااور ناکامی کی حالت میں بدحواس نہیں ہوتا۔ قرآن اس قسم کی مضبوط اور آہنی شخصیت کی اس طرح مدح سرائی کرتا ہے :

لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَ لَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ {۵۷ حدید : ۲۳}تاکہ جو چیز تم لوگوں کے ہاتھ سے چلی جائے اس پر تم رنجیدہ نہ ہو اور جو چیز تم لوگوں کوعطا ہو اس پر اترایا نہ کرو۔

شخصیات کو فقیری و امیری، تنگدستی و خوشحالی، مرض و صحت اور محبت و عداوت کے متضاد آئینوں میں ہی پہچاناجاتا ہے۔ مدتوں کے بچھڑے ہوئے محبوب سے وصال ہوتاہے تو

زندگی جنت نعیم بن جاتی ہے اور فراق کی صورت میں عذاب جحیم :

اِنَّ الۡاِنۡسَانَ خُلِقَ ہَلُوۡعًا اِذَا مَسَّہُ الشَّرُّ جَزُوۡعًا وَّ اِذَا مَسَّہُ الۡخَیۡرُ مَنُوۡعًا اِلَّا الۡمُصَلِّیۡنَ الَّذِیۡنَ ہُمۡ عَلٰی صَلَاتِہِمۡ دَآئِمُوۡنَ { ۷۰ معارج : ۱۹ تا۲۳}انسان یقینا کم حوصلہ خلق ہوا ہے، جب اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو گھبرا اٹھتا ہے اور جب اسے آسائش حاصل ہوتی ہے تو بخل کرنے لگتاہے۔ سوائے نماز گزاروں کے جو اپنی نماز کی ہمیشہ پابندی کرتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گردش روزگار نمازی کی مضبوط اور آہنی شخصیت پر اثرا نداز نہیں ہو سکتی۔ نماز انسان کو اس لا محدود طاقت سے وابستہ کر دیتی ہے جو تمام طاقتوں کی سرچشمہ ہے۔ا نسان نمازی بن جانے کے بعد چٹان کی طرح مضبوط اور سمندر کی طرح بیکراں ہو جاتا ہے۔

خدا اپنے حبیب کو نماز ہی کے ذریعے آنے والے مصائب و مشکلات کامقابلہ کر نے کے لیے آمادہ کرتا ہے۔

یٰٓاَیُّہَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا اِلَّا قَلِیْلًانِّصْفَہٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْہُ قَلِیْلًا اَوْ زِدْ عَلَیْہِ وَ رَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًااِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْکَ قَوْلًا ثَقِیْلًا {۷۳ مزمل : ۱ تا ۵}اے کپڑوں میں لپٹنے والے۔ رات کو اٹھا کیجیے مگر کم، آدھی رات یا اس سے کچھ کم کر لیجیے یا اس پر کچھ بڑھا دیجیے اور قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کیجیے۔ عنقریب آپ پر ہم ایک بھاری حکم (کا بوجھ) ڈالنے والے ہیں

رات کی نمازوں اورتلاوت قرآن کے ذریعے رسالت کے بار گراں کو اٹھانے کی تیاری کا حکم ہے۔

اِنَّہَا لَکَبِیۡرَۃٌ اِلَّا عَلَی الۡخٰشِعِیۡنَ: خشوع نہ رکھنے والوں، ذوق عبادت نہ رکھنے والوں اور دل سے عبادت بجا نہ لانے والوں پر یہ نماز بارگراں ہے۔ جب کہ خشوع رکھنے والے نماز سے جو لذت اور سکون قلب حاصل کرتے ہیں وہ کسی اور چیز سے حاصل نہیں کر سکتے۔

بعض روایات کے مطابق خاشعین سے مراد رسول خدا(ص) اور حضرت علی (ع) ہیں۔ { المیزان ۱ :۱۵۳} لفظ عمومیت رکھتا ہے اور اگرچہ تمام خاشعین کو اصولاً شامل ہے۔ تاہم اس کے مصداق کے اولین افراد محمد(ص) و علی (ع) ہیں۔ یا یوں کہنا چاہیے کہ لفظ اگرچہ عمومیت رکھتا ہے، لیکن اس لفظ کو محمد (ص) و علی(ع) کی طرح کوئی حقیقی مصداق میسر نہیں ہوا۔

الَّذِيۡنَ يَظُنُّوۡنَ اَنَّهُمۡ مُّلٰقُوۡا رَبِّهِمۡ {۲ بقرہ : ۴۶}
مفسرین لکھتے ہیں کہ یہاں ظن سے مراد یقین ہے۔ اگرچہ رب کی ملاقات کا گمان بھی باعث خشوع ہوتا ہے، لیکن اگر یقین حاصل ہو تو یہ خشوع بطریق اولی دو چند ہو گا۔

احادیث

الَّذِيۡنَ يَظُنُّوۡنَ اَنَّهُمۡ مُّلٰقُوۡا رَبِّهِمۡ میں موجود يَظُنُّوۡنَ کی وضاحت میں امام علی علیہ السلام سے مروی ہے :

يُوۡقِنُوۡنَ اَنَّهُمۡ مَّبۡعُوۡثُوۡنَ وَ الظَّنَّ مِنۡهُمۡ يَقِيۡنٍ ۔ { المیزان ۱ : ۱۵۳۔ تفسیر العیاشی ۱ : ۴۴۔ بحار الانوار ۷ : ۴۲ باب ۳ از باب اثبات الحشر و کیفیتہ و کفرہ ۔}انہیں اپنے رب سے ملاقات کا یقین ہوتا ہے۔
کافی میں حضرت امام صادق علیہ السلام سے روایت ہے :

كَانَ عَلِيٌّ اِذَا هَالَہُ شیء فَزِعَ اِلی الصَّلٰوۃِ ثُمَّ تَلَا ھٰذِہِ الْآیَۃَ: وَ اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوۃِ ۔ {اصول الکافی ۳ : ۴۸۰}حضرت علی علیہ السلام کو جب کوئی پریشانی لاحق ہوتی تو اٹھ کرنماز پڑھ لیتے اور اس آیت: وَ اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوۃِ کی تلاوت کرتے تھے۔

من لا یحضرہ الفقیہ میں حضرت امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ(ع) نے فرمایا:

الصَّبْرُ الصِّیَامُ وَ قال اِذَا نَزَلَتْ بِالرَّجُلِ النَّازِلَۃُ و الشَّدِیْدَۃُ فَلْیَصُمْ فَاِنَّ اللّٰہَ عز و جل یَقُوْلُ: وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ یعنی الصیام ۔ {اصول الکافی ۴ : ۶۳}صبر سے مراد روزہ ہے۔ جب کسی آدمی پر برا وقت آجائے تو وہ روزہ رکھ لے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَ اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ ۔

اہم نکات

۱۔ عاجزی کا نام صبر نہیں، بلکہ مشکلات و شدائد کا مقابلہ کر نے کی معنوی اور روحانی طاقت کا نام صبر ہے۔

۲۔ مشکلات کے موقع پر صبر اور نماز سے مدد لینی چاہیے۔

۳۔ نماز انسان کو اللہ کی لا محدود طاقت سے وابستہ کردیتی ہے ۔

۴۔ استعانت کے حکم سے انسان کی ناتوانی کا پتہ چلتا ہے۔

۵۔ مشکلات اور شدائد میں انسانی شخصیت کی پہچان ہوتی ہے۔

تحقیق مزید: الکافی۳ : ۴۸۰۔ ۴ : ۶۳۔ الفقیہ ۳: ۷۶ الوسائل ۸ : ۱۳۸۔

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اسۡتَعِیۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَ الصَّلٰوۃِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیۡنَ﴿سورہ بقرہ آیت ۱۵۳﴾ اے ایمان والو! صبر اور نماز سے مدد لو، اللہ یقینا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

تفسیر آیات

اس آیہ کریمہ اوربعد والی چند آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ آنے والے عظیم اور صبر آزما واقعات کے لیے مؤمنین کو تیار فرما رہا ہے۔ چنانچہ ان آیات میں صَبرو صلٰوۃ سے مدد لینے، شہداء کو مردہ نہ کہنے اور خوف، بھوک، جانی و مالی آزمائش اور مصیبت کے موقع پر کلمہ استرجاع اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّاۤ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ کہنے کی تلقین کی گئی ہے۔

واضح ہے کہ ہر انسان کو اپنی زندگی میں قانون خلقت کے تحت بھی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پھر اسلام جیسی انقلابی تحریک سے وابستہ ایک نظریاتی انسان کو تو اس انسانی اور الٰہی مشن میں گوناگوں مشکلات کاسامنا کرنا ہی پڑتا ہے۔ ا یسے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے دو چیزوں کا سہارا لینے کی تلقین فرمائی ہے ۔ ایک صبر جو انجام سے آگاہی کے ساتھ حاصل ہونے والی ایک روحانی طاقت کا نام ہے:

وَ کَیۡفَ تَصۡبِرُ عَلٰی مَا لَمۡ تُحِطۡ بِہٖ خُبۡرًا ۔ {۱۸ کہف : ۶۸}اور اس بات پر بھلا آپ کیسے صبر کر سکتے ہیں جو آپ کے احاطۂ علم میں نہیں ہے؟

اگر انسان اس داخلی اور روحانی طاقت سے سرشار ہو تو وہ اندر سے کبھی کھوکھلا نہیں ہو گا، اس میں استقامت آئے گی اور کامیاب انجام

سے عشق، اسے پہاڑ سے بھی زیادہ بلند و مضبوط حوصلہ دے گا۔ چنانچہ وہ کبھی کسی نمرود کی آگ یا کسی یزید کی تلوار سے مرعوب نہیں ہو گا۔

صبر کی ضد جَزع ہے۔ جیساکہ ارشاد الٰہی ہے:

سَوَآءٌ عَلَيۡنَآ اَجَزِعۡنَآ اَمۡ صَبَرۡنَا مَا لَنَا مِنۡ مَّحِيۡصٍ ۔ {۱۴ ابراہیم : ۲۱}ہمارے لیے یکساں ہے کہ ہم فریاد کریں یا صبر کریں، ہمارے لیے فرار کا کوئی راستہ نہیں۔

نماز او رصبر کا رشتہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے:

اِنَّ الۡاِنۡسَانَ خُلِقَ ہَلُوۡعًا اِذَا مَسَّہُ الشَّرُّ جَزُوۡعًا وَّ اِذَا مَسَّہُ الۡخَيۡرُ مَنُوۡعًا اِلَّا الۡمُصَلِّيۡنَ الَّذِيۡنَ ہُمۡ عَلٰى صَلَاتِہِمۡ

دَآئِمُوْنَ {۷۰ معارج: ۱۹ تا ۲۳}انسان یقینا کم حوصلہ خلق ہوا ہے۔ جب اسے تکلیف پہنچتی ہے تو گھبرا ٹھتا ہے اور جب اسے آسائش حاصل ہوتی ہے تو بخل کرنے لگتا ہے، سوائے نماز گزاروں کے جو اپنی نماز کی ہمیشہ پابندی کرتے ہیں۔

انسان کو اقامۂ نماز کے ذریعے اللہ کی ذات پربھروسا کرنا چاہیے۔ کیونکہ نماز ایک شخصیت ساز اور انسان ساز تربیتی نظام ہے، جس کی بدولت یہ بے ہمت انسان کائنات کی طاقت کے سرچشمے سے وابستہ ہو جاتا ہے۔ پس وہ انسان کس قدر عظیم اور طاقتور ہو گا، جس کا بھروسا ذات الٰہی پر ہو۔

اسی سورہ کی آیت ۴۵ میں صبر و نماز کے سلسلے میں تفسیر بیان ہو چکی ہے۔

احادیث

* امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

لَا تَتَهَاوَنْ بہ وَ لاَ بِصَلَاتِکَ فَاِنَّ النَّبِیْ قَالَ عِنْدَ مَوْتِہٖ: لَیْسَ مِنِّی مَنْ اِسْتَخَفَ بِصَلَاتہٖ لَا یَرِدُ عَلٰی الْحَوْضِ لَا وَ اللہ ۔ {بحار الانوار ۸۰ : ۹}تم اپنی نمازسے تساہل نہ برتوکیونکہ رسول خدا (ص) نے اپنی وفات کے وقت فرمایا : وہ شخص مجھ سے نہیں ہے جو نماز کو خفیف سمجھتا ہے۔ وہ میرے پاس حوض پر نہیں پہنچ سکے گا۔ قسم بخدا وہ نہیں پہنچے گا۔

اِنَّ شَفَاعَتَنَا لَا تَنَالُ مُسْتَخِفًّا بِالصَّلَاۃِ ۔ {الفقیہ ۱ : ۲۰۶}ہماری شفاعت اس شخص کو نہیں پہنچے گی جو نماز کو سبک و خفیف سمجھے۔

*امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ (ع)نے صبر کی تفسیر میں فرمایا:

اَلصَّبْرُ اَلصِّيَامُ وَ قَالَ اِذَا نَزَلَتْ بِالرَّجُلِ النَّازِلَةُ وِ الشَّدِيدَةُ فَلْيَصُمْ ۔ {صول الکافی ۴ :۶۳}صبر سے مراد روزہ ہے اگر کسی کو کوئی حادثہ اور شدید دقت پیش آئے تو اسے چاہیے کہ روزہ رکھے۔

اہم نکات

۱۔ نماز کے ذریعے یہ کمزور انسان کائنات کی عظیم ترین طاقت (اللہ) سے قوت حاصل کرتاہے ۔

۲۔ الٰہی انسان کامیاب انجام سے آگاہی کے باعث اضطراب کا شکار نہیں ہوتا اور ثابت قدمی کے ساتھ کامیابی کی منازل طے کرتاہے: اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ ....

تحقیق مزید: بحار الانوار ۷۹ : ۲۳۲، مصباح الشریعۃ ص ۱۸۵۔

خیالات

اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ اخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَ النَّہَارِ وَ الۡفُلۡکِ الَّتِیۡ تَجۡرِیۡ فِی الۡبَحۡرِ بِمَا یَنۡفَعُ النَّاسَ وَ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ مَّآءٍ فَاَحۡیَا بِہِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِہَا وَ بَثَّ فِیۡہَا مِنۡ کُلِّ دَآبَّۃٍ ۪ وَّ تَصۡرِیۡفِ الرِّیٰحِ وَ السَّحَابِ الۡمُسَخَّرِ بَیۡنَ السَّمَآءِ وَ الۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ﴿سورہ بقرہ آیت ۱۶۴﴾ یقینا آسمانوں اور زمین کی خلقت میں، رات اور دن کے آنے جانے میں، ان کشتیوں میں جو انسانوں کے لیے مفید چیزیں لے کر سمندروں میں چلتی ہیں اور اس پانی میں جسے اللہ نے آسمانوں سے برسایا، پھر اس پانی سے زمین کو مردہ ہونے کے بعد (دوبارہ) زندگی بخشی اور اس میں ہر قسم کے جانداروں کو پھیلایا، اور ہواؤں کی گردش میں اور ان بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان مسخر ہیں عقل سے کام لینے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔

تشریح کلمات

خَلْقِ:(خ ل ق) متعدد معنوں میں استعمال ہوتا ہے:

۱۔ ابداع یعنی ایک شے کو عدم سے وجود میں لانا۔ اسے خلق ابداعی کہتے ہیں۔ چنانچہ جہاں خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ کہا گیا ہے وہاں بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ {۲ بقرہ : ۱۱۷۔ ترجمہ : وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے۔} سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ خلق ابداعی خداوندعالم کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے۔

۲۔ ایک شے کو دوسری چیز سے بنانے کو بھی خلق کہتے ہیں جیسے: خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَۃٍ ...{۱۶ نحل: ۴ ۔ ترجمہ اس نے انسان کو ایک بوند سے پیدا کیا۔} اس معنی میں یہ لفظ غیر خدا کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ جیسے حضرت عیسیٰ (ع) سے خطاب کر کے فرمایا :

وَ اِذۡ تَخۡلُقُ مِنَ الطِّیۡنِ کَہَیۡـَٔۃِ الطَّیۡرِ بِاِذۡنِیۡ ... { ۵ مائدہ: ۱۱۰}اور جب تم میرے حکم سے مٹی سے پرندے کا پتلا بناتے تھے۔

۳۔ اندازہ گیری کے معنوں میں آتا ہے۔ جوہری نے صحاح میں کہا ہے:

اس مطلب کی وضاحت اسی آیت کے ذیل میں آئے گی۔ انشاء اللہ ۔

۴۔ جھوٹ تراشنے کو بھی خلق کہتے ہیں جیسے فرمایا: وَّ تَخۡلُقُوۡنَ اِفۡکًا ۔ { ۲۹ عنکبوت: ۱۷} اور جھوٹ گھڑ لیتے ہو۔

اخۡتِلَافِ(خ ل ف) کسی کے پیچھے آنا۔ ایک دوسرے کے طریقۂ کار میں ہم آہنگی نہ ہونا۔ آمد و رفت (آنے جانے) کو بھی اختلاف کہتے ہیں۔ حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

یَعْلَمُ ... اِخْتِلَافَ النِّیْنَانِ فِی الْبِحَارِ الْغَامِرَاتِ ۔ {بحار الانوار ۴ : ۹۲}وہ (اللہ) اتھاہ سمندروں میں مچھلیوں کی آمد و رفت کو بھی جانتا ہے۔

معصوم (ع کی زیارت میں پڑھتے ہیں: وَمُخْتَلَفُ الْمَلَائِکَۃِ ۔ {الفقیہ ۲ : ۶۰۹ زیارت جامعۃ}
''فرشتوں کے آنے جانے کی درگاہ'' اور ممکن ہے اسی سے ہو: اِخْتِلَافُ اُمَّتِیْ رَحْمَۃٌ ۔ { وسائل الشیعۃ ۲۷: ۱۴۰} ''میری امت کی آمد و رفت میں رحمت ہے۔'' یعنی جس جگہ یہ لوگ جائیں گے وہاں اسلام کا فیض پہنچائیں گے اور لوگوں کو اسلامی تہذیب و تمدن کے آداب سکھائیں گے۔

دَآبَّۃٍ (د ب ب) آہستہ آہستہ چلنا۔زمین پر رینگنے والے جاندار۔ عرف عام میں چوپاؤں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

الْمُسَخَّرِ(س خ ر) مسخر ، مطیع و فرمانبردار، رام کرنے کے معنوں میں آتا ہے۔

تَصْرِیْفِ(ص ر ف) کسی چیز کو ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف پھیر دینا۔ یعنی نقل و انتقال اور تغییر۔

يَّعۡقِلُوۡنَ(ع ق ل) عقل وہ قوت ہے جو قبول علم کی اہلیت رکھتی ہے۔ اصل میں عقل روکنے اور پابند رکھنے کے معنوں میں ہے۔ چنانچہ اونٹ کے پاؤں باندھ دینے کو عِقَال کہتے ہیں اور مضبوط قلعہ کو مَعْقِلٌ کہا جاتا ہے۔ عقل انسان کو خطرات اور نقصانات سے محفوظ رکھتی ہے اور مفید چیزوں کا پابند بنا دیتی ہے۔

تفسیر آیات

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر مخلوقات سے خالق اور مصنوعات سے صانع کے وجود کو ثابت کرنے کا طرز استدلال اختیار فرمایا ہے۔یہ طرز استدلال، ایک فطری استدلال ہونے کے ساتھ ساتھ سادہ ترین اور آسان ترین استدلال ہے جسے سطحی ذہن رکھنے والے لوگ بھی بآسانی سمجھ سکتے ہیں۔ چنانچہ لوگ اپنے تمام تر معاملات میں یہی طرز استدلال اپناتے ہیں جہاں براہ راست حس و مشاہدہ ممکن نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر ہم ایک دوسرے کے دلوں میں براہ

راست جھانک کر تو دیکھ نہیں سکتے کہ کس کے دل میں کیا ہے، تو وہاں ایک دوسرے کے قول و عمل سے دلوں کا حال معلوم کر لیتے ہیں۔

کبھی ہمیں براہ راست معلوم نہیں ہوتا کہ زید ریاضی دان ہے ،سعید ماہر نفسیات ہے اور ماجد ادیب، شاعر ہے۔ یعنی ہم ان لوگوں کے ذہن کے اندر جھانک کر نہیں دیکھ سکتے کہ ان کے اذہان میں کون سا علم ہے، لیکن ان لوگوں کی کتب، ان کے کار ہائے نمایاں اور ان کے اشعار کے ذریعے ہم ان کے علوم سے باخبر ہوتے ہیں۔ اگر علامہ اقبالؒ کے اشعار ہمارے سامنے نہ ہوتے تو ہم نہیں سمجھ سکتے تھے کہ علامہ اقبالؒ کس پایے کے مفکر ہیں۔

خداوند عالم نے اس آیہ مجیدہ میں ہمیں اپنی آفاقی کتاب (کائنات) کا مطالعہ کرنے کی دعوت دی ہے

کہ اس کتاب کا ہر باب اس کے معجزات میں سے ایک معجزہ ہے اور اس کی ہر سطر اس کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ اس کا ہر کلمہ وجود خداوندی کی براہین میں سے ایک برہان ہے۔ اس کی کتاب آفاق اور کتاب اَنْفُسْ کا ہر ورق بتا رہا ہے کہ اس کے اندر موجود حیرت انگیز مواد اور مطالب ارادے و شعور سے ہی مرتب ہو سکتے ہیں۔ ان حکمتوں اور پیچیدہ ترین خلقت و صنعت کے پیچھے ایک حکیمانہ ارادہ کار فرما ہے۔

مردہ مادے سے ایک زندہ خلیے کا از خود اور اتفاقاً وجود میں آنا ممکن نہیں ہے۔ ایک کمپیوٹر کا اتفاقیہ طور پرخودبخود وجود میں آنا شاید ممکن ہو، لیکن اس کمپیوٹر کو ایجاد کرنے والے دماغ کا خودبخود وجود میں آنا ممکن نہیں ہے۔

اتفاق کی امکانی صورت

ایک مغربی مفکر اپنی کتاب میں لکھتا ہے(جس کا ذکر پہلے بھی ہو چکا ہے) :

دس ٹوکنوں پر ایک سے دس تک نمبر لگائیں پھر انہیں اپنی جیب میں ڈال کر خوب ہلائیں۔ اس کے بعد ترتیب کے ساتھ جیب سے نکالیں۔ جس ٹوکن کو جیب سے نکالا ہے، اسے دوبارہ جیب میں ڈال کر ہلائیں پھر دوسری بار دوسرا ٹوکن نکالیں۔ اس طرح ایک نمبر ٹوکن کے اتفاقیہ طور پر نکلنے کا امکان دس میں سے ایک ہے۔ ایک اور دو کے بالترتیب نکل آنے کا امکان سو میں سے ایک ہے۔ ایک دو اور تین کے ترتیب سے نکل آنے کا امکان ایک ہزار میں سے ایک ہے۔ ایک دو تین اور چار کے ترتیب سے نکل آنے کا احتمال دس ہزار میں سے ایک ہے۔ ایک دو تین چار اور پانچ کے ترتیب کے ساتھ نکل آنے کا امکان ایک لاکھ

میں سے ایک ہے۔ اس طرح ایک سے لے کر دس تک کے ترتیب کے ساتھ اتفاقیہ طور پر نکل آنے کا احتمال دس ارب میں سے ایک ہے۔

اس سادہ مثال کے بعد انسانی خلقت پر ایک نظر ڈالیں کہ انسان کئی ملین خلیوں کی ترتیب و ترکیب سے وجود میں آیا ہے۔ گویا انسان کی خلقت اربوں ٹوکنوں کو ترتیب کے ساتھ رکھنے سے ہوئی ہے۔ اب سوچیے کہ دس ٹوکنوں کے ترتیب کے ساتھ نکل آنے کا احتمال دس ارب احتمالات میں سے ایک ہے تو اگر یہ ٹوکن کئی ملین ہوں تو ترتیب کا احتمال کتنا ہوگا؟ جواب صفر ہے۔ آسمانوں کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے :

لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۔ {۴۰ مومن: ۵۷}آسمانوں

اور زمین کا پیدا کرنا انسانوں کے خلق کرنے سے زیادہ بڑا کام ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

بنا برایں عقل، منطق کی رو سے یہ ممکن ہی نہیں کہ یہ عظیم کائنات کسی علیم و حکیم و قادر ہستی کے ارادے کے بغیر اتفاقاً اور خودبخود وجود میں آئی ہو۔ اثبات رب کے لیے عقلی استدلال کی یہ معقول ترین روش قرآن کا طرہ امتیاز ہے۔

۱۔ اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ آسمانوں کا ذکر قران مجید میں جمع کے ساتھ تقریباً دو سو آیات میں اور مفرد کے ساتھ تقریباً ایک سو آیات میں ہوا ہے۔ جب کہ زمین (ارض) کا ذکر ہمیشہ مفرد لفظ کے ساتھ ہوا ہے۔ صرف ایک آیت ہے جس سے یہ خیال ظاہر ہوا ہے کہ زمین بھی متعدد ہیں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ... خَلَقَ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ وَّ مِنَ الۡاَرۡضِ

مِثْلَهُنَّ ۔ {۶۵طلاق : ۱۲۔ ترجمہ ۔۔۔ سات آسمان بنائے، انہی کی طرح زمین بھی۔}

کتاب کائنات کا سماواتی باب توحید کے گوناگوں مباحث و دروس سے لبریز ہے۔ نظام کی وحدت سے نظم دہندہ کی وحدت کا ثبوت ملتا ہے۔ وحدتِ خلقت سے توحید خالق کا پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ آج کا ہر طالبعلم جانتا ہے کہ ایٹم کی تشکیل اور نظام شمسی کی تشکیل میں کوئی فرق نہیں ہے۔ نظام شمسی اور کہکشاؤں کے نظام میں بھی کوئی فرق نہیں ہے۔ تمام کائنات میں ایک ہی طرز تنظیم اور ایک ہی طریقے کا نظام رائج ہے۔ اگر ایٹمی نظام میں پروٹون کو مرکزی حیثیت حاصل ہے اور دیگر الیکٹرونی سیارے اپنے مرکز کے گرد گھومتے ہیں تو نظام شمسی اور کہکشاؤں کا نظام بھی تو یہی ہے۔

حقیقت ایک ہے ہر شے کی خاکی ہوکہ نوری ہو

ماہرین کا اندازہ ہے کہ ہر کہکشاں میں کم از کم ایک سو بلین (ایک کھرب)ستارے موجود ہوتے ہیں۔ اب تک ایک سو بلین (ایک کھرب)کہکشائیں دریافت ہو چکی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک دوسرے سے دو ملین نوری سال کے فاصلے پر ہے۔
آسمانوں کی وسعت اور عظمت کا اندازہ لگا لیجیے۔

اب آپ ہرکہکشاں میں موجود ایک لاکھ ملین (سو ارب)ستاروں کو خود ایک لاکھ ملین (سو ارب)کہکشاؤں سے ضرب دیں۔ تو حیرت انگیز تعداد سامنے آتی ہے۔

واضح رہے کہ ان ستاروں میں سے ہر ایک اپنی جگہ ہمارے سورج کی طرح ایک مجموعہ شمسی

ہے بلکہ دیگر ستارے ہمارے سورج سے لاکھوں گنا بڑے ہیں۔

یہ اعداد و شمار انسان کی اب تک کی علمی رسائی کا نتیجہ ہیں، ورنہ کائنات کا وہ حصہ جو انسان کی علمی رسائی سے ماوراء ہے، اس حصے سے کہیں زیادہ عظیم ہے جس کو انسان جان چکا ہے:

وَ السَّمَآءَ بَنَیۡنٰہَا بِاَیۡیدٍ وَّ اِنَّا لَمُوۡسِعُوۡنَ ۔ {۵۱ ذاریات :۴۷}اور آسمان کو ہم نے قوت سے بنایااور ہم ہی وسعت دینے والے ہیں
صدق اللہ العلی العظیم۔

۲۔ وَ الۡاَرۡضِ زمین۔ زمین جسامت کے لحاظ سے نظام شمسی کا پانچواں اور سورج سے فاصلے

کے لحاظ سے تیسرا سیارہ ہے۔ اس کی متعدد حرکات ہیں:

۱۔ حرکت محوری: اس حرکت کے تحت زمین اپنے مدار کے گرد لٹو کی طرح گھومتی ہے، جس سے روز و شب وجود میں آتے ہیں۔

۲۔ حرکت انتقالی: اس حرکت کے تحت زمین ۳۶۵ روز پانچ گھنٹے ۲۸ منٹ اور ۴۰ سیکنڈ میں سورج کے گرد ایک چکر پورا کرتی ہے۔ اس طرح سال میں ۹۳۰ ملین کلومیٹر کی مسافت ۲۹ کلومیٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے طے کرتی ہے۔

۳۔ سورج کے ہمراہ حرکت: سورج اپنے سیاروں کے ساتھ مجموعی طور پر ایک خاص انداز میں اپنے پورے نظام کے ساتھ حرکت میں ہے اور زمین چونکہ اس نظام شمسی کی ایک اہم فرد ہے،

اس لیے یہ بھی سورج کے ہمراہ نظام شمسی کے مدار میں حرکت کرتی ہے۔

اگر زمین موجودہ حجم سے بڑی ہوتی تو ہوا کے ذرات کشش زیادہ ہونے کی وجہ سے سطح زمین میں جذب ہو جاتے اور زمین قابل سکونت نہ رہتی اور اگر زمین موجودہ حجم سے چھوٹی ہوتی تو ہوا کے ذرات اس کی فضا میں محفوظ نہ رہتے اور کشش کم ہونے کی وجہ سے منتشر ہو جاتے۔

اگر زمین سورج سے زیادہ دور ہوتی تو سردی کی وجہ سے یہ قابل سکونت نہ رہتی اور اگر سورج سے زیادہ نزدیک ہوتی تو گرمی کی وجہ سے قابل سکونت نہ رہتی۔ لہٰذا زمین مناسب فاصلے پر ہے۔ سورج سے یہاں پہنچنے والی حرارت بھی مناسب ہے۔ زمین کی کشش بھی مناسب ہے۔ زمین کا حجم اس کی محوری (روزانہ

کی) حرکت کے ساتھ متناسب ہے اور سالانہ گردش بھی مختلف موسموں کے لیے مناسب ہے۔ زمین کا وزن اس کی کشش کے ساتھ مناسبت رکھتاہے۔ زمین پر موجود حرارت پانی کے مزاج کے لیے بھی مناسب ہے، ورنہ بہت زیادہ درجہ حرارت یا بہت کم درجہ حرارت میں آکسیجن اور ہائیڈروجن کا اتحاد ممکن نہیں رہتا۔

زمین اگر موجودہ صورت حال سے زیادہ نرم ہوتی تو اس پر کوئی عمارت قائم نہ ہو سکتی اور اگر موجودہ صورت سے زیادہ سخت ہوتی تو سبزہ اگنا ممکن نہ ہوتا۔

زمین ستر (۷۰) سے زائد عناصر پر مشتمل ایک قابل حیات اور مہمان نواز سیارہ ہے، جس کے اندر بے شمار نعمتیں موجود ہیں:

وَ فِی الۡاَرۡضِ اٰیٰتٌ لِّلۡمُوۡقِنِیۡنَ {۵۱ ذاریات : ۲۰}اور زمین میں اہل یقین کے لیے نشانیاں ہیں۔

۳۔ وَ اخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَ النَّہَارِ رات اور دن کی آمد و رفت۔ نور اور تاریکی کا تبادلہ، شروق و غروب کا یکے بعد دیگرے آنا، شعور و ارادہ اور حکمت و صنعت کی ایک دلیل ہی نہیں، بلکہ اس صاحب قصد و ارادہ کے معجزات میں سے ایک معجزہ ہے۔ دن میں سورج کا نور سرچشمۂ حیات ہے اور اس تاریک و سرد فضا میں نور و حرارت کا منبع ہے۔ اگر یہ عظیم چراغ گل ہو جائے تو زندگی کا یہ کاروان فوراً رک جائے گا۔

تاہم اگریہ حیات بخش نور بلا وقفہ جاری رہے اور رات کے ذریعے اس نور اور شعاع کی تابش کو قابو میں نہ رکھا جائے تو یہ نور سبب حیات بننے کی بجائے مہلک ثابت ہو سکتا ہے۔ جیساکہ پانی

اگرچہ منبع حیات ہے، لیکن اس کی کثرت سیلاب کی شکل اختیار کرکے مہلک ثابت ہوتی ہے :

قُلۡ اَرَءَیۡتُمۡ اِنۡ جَعَلَ اللّٰہُ عَلَیۡکُمُ الَّیۡلَ سَرۡمَدًا اِلٰی یَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ مَنۡ اِلٰہٌ غَیۡرُ اللّٰہِ یَاۡتِیۡکُمۡ بِضِیَآءٍ ۔ {۲۸ قصص ۷۱}کہدیجیے!یہ تو بتاؤ کہ اگر اللہ قیامت تک تم پر ہمیشہ کے لیے رات کو مسلط کر دے تو اللہ کے سوا کون سا معبود ہے جو تمہیں روشنی لا دے؟

قُلۡ اَرَءَیۡتُمۡ اِنۡ جَعَلَ اللّٰہُ عَلَیۡکُمُ النَّہَارَ سَرۡمَدًا اِلٰی یَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ مَنۡ اِلٰہٌ غَیۡرُ اللّٰہِ یَاۡتِیۡکُمۡ بِلَیۡلٍ تَسۡکُنُوۡنَ فِیۡہِ ۔ {۲۸ قصص : ۷۲}کہدیجیے! یہ تو بتاؤ کہ اگر قیامت تک اللہ تم پر ہمیشہ کے لیے دن کو مسلط کر دے تو اللہ کے سوا کون سا معبود ہے جو تمہیں رات لا دے جس میں تم سکون حاصل کرو؟

۴۔ وَ الۡفُلۡکِ سمندروں میں چلنے والی کشتیاں اگرچہ انسانی صنعت و حرفت کا نتیجہ ہیں، لیکن

انسان چونکہ خود اللہ کی نشانیوں میں سے ایک عظیم نشانی ہے، اس لیے اس کے ہاتھ سے وجود میں آنے والی صنعتیں اور ایجادات بھی اللہ کی نشانیاں ہیں نیز سمندروں کے پانی کا رخ اور پانی کا قدرتی مزاج جو اپنے سے ہلکی چیزوں کو اپنی پشت پر اٹھا لیتا ہے۔ بنا بر ایں ہوا یا کسی اور قوت و طاقت کے ذریعے غول پیکر بحری جہازوں کو بآسانی دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پہنچانا بھی اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔

۵۔ وَ مَآ اَنۡزَلَ آسمان سے پانی کا نزول۔ انسان ایک جگہ سے دوسری جگہ پانی و دیگر مائعات، مثلاً تیل وغیرہ منتقل کرنے کے لیے ٹینکر، پائپ لائن اور نہروں کا استعمال کرتے ہیں اور اس پر بے پناہ سرمایہ اور طاقت خرچ ہو جاتی ہے اور پانی ذخیرہ کرنے کے لیے بڑے بڑے ڈیم بنائے جاتے ہیں، ان پر بھی کثیر سرمایہ اور وقت صرف ہوتا

ہے۔ قدرت بھی یہی کام سر انجام دیتی ہے۔ مگر اس پر جو سرمایہ خرچ ہوتا ہے، وہ ہے فقط سورج کی شعاعوں کے ذریعے حرارت پہنچانا۔ البتہ یہ شعاعیں صرف اسی مقصد کے لیے نہیں ہیں، ان کی سینکڑوں دیگر ذمے داریاں بھی ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اپنی حرارت کے ذریعے پانی کو بخارات میں تبدیل کرتی ہیں۔ یہ بخارات ہوا کے دوش پر سوار ہو کر فضا میں منڈلانے لگتے ہیں، پھر ایک خاص درجے کی برودت اور سردی پا کر بادل کی شکل اختیار کرتے ہیں۔یہ بادل ٹینکروں، نہروں اور پائپ لائنوں سے ہزار گنا بہتر، سریع تر اور مفید انداز میں ایک جگہ سے دوسری اطراف میں لاکھوں ٹن پانی لے کر جاتے ہیں۔ جس علاقے کی سیرابی مقصود ہو، اس پورے علاقے پر پانی کا وسیع چھڑکاؤ کیا جاتا ہے، جسے ہم بارش کہتے ہیں۔ سُبۡحٰنَ الۡخَلّٰقُ الۡعَلِیۡمُ ۔

۶۔ خشک اور بے جان زمین میں جان پڑ جانا:
زمین ابتدا میں سلگتی آگ کا ایک آتشی کرہ تھی۔ اس میں زندگی کے آثار نہ تھے اور نہ ہی یہ زندگی کے لیے سازگار تھی۔ یہاں نہ تو نباتاتی حیات ممکن تھی اور نہ حیوانی حیات۔ زمین مردہ مادے پر مشتمل ایک مردہ کرے کی شکل میں تھی۔

ہم پہلے بھی ذکر کر چکے ہیں کہ مردہ مادے سے حیات وجود میں نہیں آ سکتی، بلکہ حیات کا سرچشمہ حیات ہی ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ سوال الحادی نظریہ رکھنے والوں کے لیے تشنۂ جواب ہے کہ مردہ زمین سے حیات کس طرح وجود میں آئی؟ جب کہ اسلامی مؤقف کے مطابق مردہ زمین اور بے جان مادے میں حیات کا پیدا ہونا اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے کہ اللہ ہی بے جان زمین کو زندگی عطا کر سکتا ہے۔

۷۔ وَّ تَصۡرِیۡفِ الرِّیٰحِ ہواؤں کی گردش۔ اللہ تعالیٰ کی بے پایاں قدرت کی نشانیوں میں سے ایک اہم نشانی کائنات کی مختلف چیزوں میں ارتباط اور ہم آہنگی ہے۔ مثلاً اگر پستان مادر میں موجود دودھ اور نومولود بچے کے معدے اور تنفس کے نظام میں باہمی ہم آہنگی نہ ہوتی تو زندگی کا یہ قافلہ رواں دواں نہ رہ سکتا تھا۔ ہم ہوا اور دیگر موجودات میں ربط و ہم آہنگی پر ایک اجمالی نظر ڈالتے ہیں کہ دیکھیں اس نظام میں ہوا کیا کردار ادا کرتی ہے:

۱۔ تنفس: حیوانات اور نباتات کی زندگی اس ہوا کے ذریعے سانس لینے کی مرہون منت ہے۔ انسان ایک سو دس لیٹر فی گھنٹہ ہوا خرچ کرتا ہے۔ یہ ہوا اگر پانچ منٹ تک میسر نہ آئے تو انسان اپنی زندگی کو جاری نہیں رکھ سکتا۔

۲۔ آواز کی لہروں کو دور تک منتقل کرنے کا ذریعہ بھی ہوا ہے۔

۳۔ آگ بھی ہوا کے وجود کی مرہون منت ہے۔

۴۔ ہوا کے ذریعے جسم پر ایک خاص دباؤ برقرار رہتا ہے۔ اگر یہ دباؤ کم ہو جائے تو ہمارے جسم کی رگیں پھٹ جائیں اور ان سے خون جاری ہوجائے۔

۵۔ بادلوں کی نقل و حرکت ہوا کے ذریعے ممکن ہوتی ہے۔

۶۔ آسمان سے روزانہ ہزاروں شہاب ثاقب زمین پر گرتے ہیں۔ اگر یہ ہوائی کرہ ڈھال کا کام دیتے

ہوئے انہیں فضا ہی میں جلا کر راکھ نہ کرتا تو زمین پر تباہی پھیل جاتی اور زندگی ناممکن ہو جاتی ۔

۷۔ روشنی کا پھیلاؤ بھی ہوا کے ذریعے ہوتا ہے۔

۸۔ بارداری: یہ عمل ہوا کے ذریعے انار، مالٹے، روئی اور خوبانی جیسے دانہ دار نباتات میں انجام پاتا ہے۔ شگوفوں کے اندر دانے پک جاتے ہیں تو ان کے اندر موجود کلیاں کھل جاتی ہیں اور یہ نہایت باریک دانے ہواؤں کے ذریعے اڑ کر مادہ پودوں کے پھولوں پر جا گرتے ہیں۔ اس طرح بار داری کا عمل انجام پاتا ہے:

وَ اَرۡسَلۡنَا الرِّیٰحَ لَوَاقِحَ ... {۱۵ حجر : ۲۲}اور ہم نے باردار کنندہ ہوائیں چلائیں۔

۹۔ ہوا حیوانات اور نباتات میں تبادلۂ حیات کا ذریعہ بھی ہے۔

۱۰۔ سورج کی شعاعیں خلا سے گزرتی ہوئی فضا میں داخل ہوتی ہیں۔ فضا میں ایک خاص ہوائی غلاف ہے،جسے اوزون کہتے ہیں۔ یہ غلاف سورج سے آنے والی بہت سی قاتل شعاعوں کو زمین تک پہنچنے سے پہلے ہی روک لیتا ہے۔ ان میں ماورائے بنفش شعاعیں بہت خطرناک ہیں۔ گرین ہاؤس کے عمل سے جہاں جہاں اوزون کے غلاف میں شگاف پڑے ہیں وہاں سے ماورائے بنفش شعاعوں کی زمین کی طرف آمد میں اضافہ ہوا ہے جو ایک خطرہ ہے۔

۱۱۔ خوشبواور بدبو کو دماغ تک پہنچانے کا ذریعہ بھی ہوا ہے۔

۸۔ وَ السَّحَابِ الْمُسَخَّرِ فضا میں مسخر بادل۔ بادل کا فضا میں معلق ہونا، ہوا کے ذریعے اس کا ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا، بادل کا خشک اور بے جان زمینوں کو اپنے پانی سے سیراب کرنا، ایسے امور ہیں جن سے ایک باشعور حکیمانہ ارادے کا پتہ ملتا ہے۔ کائنات کی ہر مخلوق کے اندر اس نظام کی بقا کے کتنے سامان موجود ہیں نیز یہ کہ ہوا، بادل، پانی، خاک اور دھوپ میں کس قدر ہم آہنگی ہے۔ اگر یہاں کوئی شعور اور ارادہ نہ ہوتا تو ان میں سے ہر کوئی دوسرے کے لیے اگر متضاد نہ سہی تو غیر ضروری اور غیر مفید ضرور ہوتا۔

یہ سب حکمتیں، یہ معجزات اور یہ محیر العقول کارنامے چشم بینا نہ رکھنے والوں اور غفلت برتنے والوں کے لیے روز انہ کے معمولات اور ہمیشہ سے مانوس چیزیں ہیں۔ یہ ان نادانوں کے لیے نہ تعجب کا مقام ہے، نہ حیرت کی بات۔ بھلا

بادل سے بارش برسنا کوئی تعجب کی بات ہے؟ یہ تو روز کا معمول ہے۔ جس طرح ایک نہایت خوبصورت وادی میں آنکھیں کھولنے والا اس مقام کی خوبصورتی سے واقف نہیں ہوتا بلکہ باہر سے آنے والا جانتا ہے کہ یہ وادی کس قدر حسین ہے۔ بالکل اسی طرح کائنات پر عقل و تدبر کے ساتھ نگاہ ڈالنے والے ہی سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کائنات کس قدر حسین اور پراسرار ہے اور اس میں خالق کائنات کے دست قدرت کی کس قدر نشانیاں ہیں: لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ۔صَدَقَ اللّٰہُ الۡعَلِیُّ الۡعَظِیۡم ۔

احادیث

حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے :

وَیْلٌ لِمَنْ سَمِعَ هَذِهِ الْاٰیَاتِ فَمَجَّ فیها۔ان آیات کو سننے کے بعد ان میں تفکر نہ کرنے والوں پر افسوس ہو۔

حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے روایت ہے:

اِنَّ اللهَ تَبَارَکَ وَ تَعَالٰی اَکْمَلَ لِلنَّاسِ الْحُجَجَ بِالْعُقُوْلِ ... {اصول الکافی ۱ : ۱۳ کتاب العقل}اللہ تعالیٰ نے عقول کے ذریعے لوگوں پر اپنی حجت پوری کی ہے۔

روایت ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے مفضل سے فرمایا :

وَ حَسْبُکَ بِهَذَا النَّسِیْمِ اَلْمُسَمَّی هَوَائً عِبْرَةً و ما فیہ من المصالح، فَاِنَّہٗ حَیَاةُ هَذِهِ الْاَبْدَانِ وَ الْمُمْسِکُ لَهَا مِنْ دَاخِلٍ بِمَا یَسْتَنْشِقُ مِنْہُ مِنْ خَارِجٍ بِمَا یُبَاشِرُ مِنْ رَوْحِہٖ وَ فِیْہِ تطرد هَذِهِ الْاَصْوَاتُ فَیُؤَدِّی الْبُعْدَ الْبَعِیْدَ

و هُوَ الْحَامِلُ هٰذِهِ الْاَرْوَاحَ يُنْقِلُهَا مِنْ مَوْضِعٍ اِلٰی مَوْضِعٍ۔ اَلَا تَرَی کَیْفَ تَاتِیْکَ الرَّائِحَۃُ مِنْ حَیْثُ تَھَبُ الرِّیْحُ فَکَذٰلِکَ الصَّوْتُ وَ ھُوَ الْقَابِلُ لِھٰذَا الْحَرِّ وَ الْبَرْدِ الَّذَیْنِ یَتَعَاقَبَانِ عَلَی الْعَالَمِ لِصَلَاحِہٖ۔ وَ مِنْہُ ھٰذِہِ الرِّیْحُ الْھَابَّۃُ فَالرِّیْحُ تُرَوِّحُ الْاَجْسَامَ وَ تُزْجِی السَّحَابَ مِنْ مَّوْضِعٍ اِلٰی مَوْضِعٍ لِیَعُمَّ نَفْعُہٗ حَتّٰی یَسْتَکْثِفَ فَیُمْطِرَ وَ تَفِضَّہٗ حَتّٰی یَسْتَخِفَّ فَیَتَقَشّٰی۔ وَ تُلَقِّحُ الشَّجَرَ وَ تَسَیَّرَ السُّفُنَ۔ وَ تَرَخّٰی الْاَطْعِمَۃَ۔ وَ تَبَرَّدَ الْمَآءَ۔ وَ تَشَبَّ النَّارَ۔ وَ تَجَفَّفُ الْاَشْیَآءَ النَّدِیَّۃِ وَ بِالْجُمْلَۃِ اَنَّھَا تُحْیِی کَلَّمَا فِی الْاَرْضِ ۔ {توحید مفضل ص ۱۴۱}سمجھنے کے لیے یہی نسیم اور اس میں جو مصلحتینہیں کافی ہے جسے ہوا کہتے ہیں۔۱۔ کیونکہ یہ ہوا ان جسموں کی زندگی ہے۔ ۲۔ باہر سے ہوا کے ساتھ سانس لینے سے داخلی اعضا کا تحفظ ہوتا اور راحت ملتی ہے۔ ۳۔ اس ہوا کے فوائد میں آوازوں کا سننا ہے کہ یہ آواز کو دور دراز تک پہنچا دیتی ہے۔ ۴۔ تمہیں معلوم ہے کہ خوشبو تمہارے پاس ہوا کے ساتھ آتی ہے اسی

طرح آواز بھی ہے۔ ۵۔ یہ ہوا اس جہاں کے فائدے کے لیے یکے بعد دیگرے آنے والی حرارت اور ٹھنڈک کو قبول کرتی ہے۔۶۔ چلنے والی ہوائیں فرحت بخش ہوتی ہیں۔ ۷۔ بادلوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتی ہیں اور اس کا فائدہ عام ہو جاتا ہے کہ جب بادل سنگین ہوتا ہے تو بارش برساتا ہے۔ جب بارش برس جاتی ہے تو یہ بادل ہلکا ہو کر پراگندہ ہو جاتا ہے۔ ۸۔ یہ ہوا درختوں میں بار داری کا عمل انجام دیتی ہے۔ ۹۔ سمندر میں کشتیوں کو چلاتی ہے۔ ۱۰۔ کھانے کی چیزوں کو نرم کر دیتی ہے۔ ۱۱۔ پانی کو ٹھنڈا کر دیتی ہے۔ ۱۲۔ آگ جلانے میں مدد دیتی ہے۔ ۱۳۔ مرطوب چیزوں کو خشک کر دیتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ زمین کی تمام موجودات کے لیے ہوا حیات بخش ہے۔

اہم نکات

۱۔ کائنات کی منظم ،ہم آہنگ ،عظیم اور حکیمانہ خلقت ایک علیم وحکیم اورعظیم خالق کے وجود کی دلیل ہے ۔

۲۔ انسانی ایجادات بھی اللہ کی نشانیاں ہیں۔ کیونکہ انسان خود اللہ کی ایجاد ہے: وَ الۡفُلۡکِ الَّتِیۡ تَجۡرِیۡ ----

۳۔ مخلوقات کے ذریعے خالق کوپہچاننا عقل و تفکر پر موقوف ہے: لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ ۔

۴۔ نظام کائنات کی وحدت، خالق کائنات کی توحید پر دلیل ہے

وَ سَخَّرَ لَكُمۡ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا مِّنۡہُ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ﴿سورہ جاشیہ آیت ۱۳﴾

اور جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے سب کو اس نے آپنی طرف سے تمہارے لیے مسخر کیا، غور کرنے والوں کے لیے یقینا اس میں نشانیاں ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ سَخَّرَ لَكُمۡ: تسخیر آسمان و زمین کے موضوع پر تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سورہ ابراہیم آیت ۳۲۔ سورہ لقمان آیت ۲۰۔

۲۔ جَمِیۡعًا مِّنۡہُ: ان سب کی تسخیر اللہ کی طرف سے ہے یا ان سب کی ابتدا اللہ کی طرف سے ہے۔ کسی غیر اللہ کی طرف سے نہیں تو پھر تمہاری زندگی کو کون چلا رہا ہے؟

۳۔ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ: قرآن کا مخاطب عقل و فکر ہے اور عقل و فکر سے کہا جا رہا ہے: کس نے تمہاری زندگی کے لیے آسمانوں اور زمین کی موجودات کو مسخر کیا ہے؟ اگر بتوں نے یہ کام کیا ہے تو انہیں رَب بناؤ، اگر اللہ نے کیا ہے تو اللہ کو رَب تسلیم کرو۔ اس میں انسانی ضمیر اور وجدان کو جھنجھوڑا ہے۔

لباس

یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ قَدۡ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡکُمۡ لِبَاسًا یُّوَارِیۡ سَوۡاٰتِکُمۡ وَ رِیۡشًا ؕ وَ لِبَاسُ التَّقۡوٰی ۙ ذٰلِکَ خَیۡرٌ ؕ ذٰلِکَ مِنۡ اٰیٰتِ اللّٰہِ لَعَلَّہُمۡ یَذَّکَّرُوۡنَ﴿سورہ أعراف آیت ۲۶﴾۔ اے فرزندان آدم! ہم نے تمہارے لیے لباس نازل کیا جو تمہارے شرم کے مقامات کو چھپائے اور تمہارے لیے آرائش (بھی) ہو اور سب سے بہترین لباس تو

تقویٰ ہے، یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے شاید یہ لوگ نصیحت حاصل کریں۔

تشریح کلمات

رِیۡشًا:(ر ی ش) پرندے کے پروں کو کہتے ہیں اور یہ پر ان کے لیے لباس کی جگہ ہوتے ہیں، اس لیے لباس کو ریش کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

اس آیت میں ایک ایسے مسئلے کے متعلق گفتگو ہو رہی ہے جو انسان کی شرم و حیا سے بھی مربوط ہے اور ساتھ جمالیاتی قدروں سے بھی مربوط ہے۔ یہ دونوں فطری اور طبعی ہیں۔ پہلے بھی ذکر ہوا کہ انسان میں شرم و حیا تہذیب و تربیت کی طرف سے آنے والی اکتسابی چیز نہیں ہے بلکہ یہ ایک فطری چیز ہے۔ انسان کو اپنے فطری تقاضوں پر چھوڑ دیا جائے تو وہ اس شرم و حیا کو از خود محسو س کرتا ہے اور بغیر کسی تعلیم و تلقین کے اپنی شرم کے مقامات کو

چھپانے لگتا ہے۔ حضرت آدم و حوا نے جنت کے پتوں سے اس طبعی اور فطری محرک کی بنا پر اپنے لیے ستر بنایا تھا۔

اس آیہ شریفہ میں فرمایا: ہم نے لباس نازل کیا ہے۔ نزول خلق کے معنوں میں بھی قرآن میں استعمال ہوا ہے جیسا کہ لوہے کے بارے میں فرمایا: وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ (۵۷ حدید: ۲۵) ہم نے لوہا نازل کیا۔ اگرچہ لباس انسان کے اپنے ہاتھوں سے بنایا جاتا ہے، تاہم کائنات میں رونما ہونے والا ہر عمل بالآخر اللہ تعالیٰ پر منتہی ہے۔ اس لیے یہاں رونما ہونے والا ہر عمل اللہ کی طرف منسوب ہوتا ہے: وَ اللّٰہُ خَلَقَکُمْ وَ مَا تَعْمَلُوْنَ (۳۷ صافات : ۹۶) تمہیں اور تمہارے اعمال کو اللہ نے پیدا کیا ہے۔

اور ممکن ہے کہ اَنۡزَلۡنَا سے مراد شرعنا ہو۔یعنی ہم نے لباس سے ستر پوشی کو واجب قرار دیا ہے۔

وَ رِیۡشًا: یعنی لباس جہاں ذریعہ حفظ حیاء و عفت ہے، وہاں انسان کے لیے زیب تن بھی ہے۔ قدرت نے جمالیاتی ذوق جہاں انسانی فطرت میں ودیعت فرمایا ہے، وہاں اس ذوق کی تکمیل کے لیے ضروری تعلیم بھی دی ہے۔ قُلۡ مَنۡ حَرَّمَ زِیۡنَۃَ اللّٰہِ الَّتِیۡۤ اَخۡرَجَ لِعِبَادِہٖ ... (۷ اعراف : ۳۲) یہاں سے استنباط کیا جاتا ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے لباس کے زینت بنانے کو بطور احسن ذکر کیا ہے، لہٰذا اس زینت کو اختیار کرنا نہ صرف مباح ہے بلکہ اعتدال کی حدود میں رہ کر اس کو اختیار کرنا مستحسن بھی ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

اَزْیَنُ اللِّبَاسِ لِلْمُؤمِنِ لِبَاسُ التَّقْوَی ---- (مستدرک الوسائل ۳۲۵:۳)مؤمن کے لیے زیبا ترین لباس تقویٰ کا لباس ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ لِبَاسُ التَّقْوٰی ۙ ذٰلِکَ خَیْرٌ ---- مگر ظاہری لباس بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے، جس سے اولاد آدم کی ستر پوشی ہوتی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے۔ جس سے اللہ نے اولاد آدم کو نوازا ہے دوسروں کو نہیں نوازا۔ اور یہ مؤمنین کے لیے فرض کی ادائیگی کا ذریعہ ہے۔ تمہارا بہترین لباس وہ ہے جو تجھے اللہ سے دور نہ کرے بلکہ اس کے ذکر، شکر اور اطاعت کے ذریعے اللہ سے قریب کرے اور تجھے خود پسندی دکھاوے، زینت و تفاخر اور تکبر پر نہ اکسائے۔ ایسا کرنا دین کے لیے آفت اور قساوت قلبی کا باعث ہے۔ جب تم اپنا لباس پہن لو تو یہ بات ذہن میں لاؤ۔ اللہ نے اپنی رحمت سے تمہارے گناہوں کو چھپایا ہے اور جیسے تو نے اپنے ظاہر کو

کپڑے سے چھپایا ہے، اپنے باطن کو بھی چھپا۔ تیرا باطن، سچائی کی ہیبت کے پردے میں اور ظاہر اطاعت کے پردے میں ہونا چاہیے۔ اللہ کے فضل و کرم سے یہ بات سمجھو کہ اس نے اپنے فضل سے لباس کے مواد فراہم کیے تاکہ ظاہری شرم گاہوں کی پردہ پوشی ہو جائے اور توبہ و انابت و فریاد رسی کا دروازہ کھول کر گناہ اور بداخلاقی کی باطنی شرم گاہوں کی ستر پوشی فرمائی۔ ملاحظہ ہو مستدرک الوسائل ۳:۳۲۴۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

خیر لباس کل زمان لباس اہلہ ۔ (الکافی ۱: ۴۱۱)ہر زمانے کا بہترین لباس، اس زمانے کے لوگوں کا لباس ہے۔

اسلام کی اس انسانی و فطری تعلیم کی وجہ سے افریقہ اور ہندوستان کی بہت سی متوحش قوموں کو ستر پوشی کرنے اور لباس پہننے کا سلیقہ آگیا، جس کی تفصیل تفسیر المنار نے بیان کی ہے۔

وَ لِبَاسُ التَّقْوٰی ۙ ذٰلِکَ خَیْرٌ: جس کے پاس تقویٰ ہے وہ شرم و حیا کا احساس کرتا ہے اور اس احساس اور انسانی قدروں کا موجود ہونا بہترین زینت اور ساتھ عفت کا بھی بہترین محرک ہے۔

اہم نکات

۱۔ قرآن کی نظر میں پرکشش شخصیت کا مالک وہ ہے جو مادی زینت (لباس) اور روحانی زینت (تقویٰ) دونوں سے مزین ہو۔

اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ ؕ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَ اَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَ عَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَ ابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۪ وَ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۪ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ۚ وَ لَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَ اَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ ۙ فِى الْمَسٰجِدِ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ﴾سورہ بقرہ آیت ۱۸۷﴿ اور روزوں کی راتوں میں اپنی بیویوں کے پاس جانا تمہارے لیے حلال کر دیا گیا ہے، وہ تمہارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو، اللہ نے دیکھا کہ تم اپنے آپ سے خیانت کر رہے تھے پس اللہ نے تم پر عنایت کی اور تم سے درگزر فرمایا، پس اب تم اپنی بیویوں سے مباشرت کرو اور اللہ نے جو تمہارے لیے مقرر فرمایا ہے اسے تلاش کرو اور (راتوں کو) خوردونوش کرو، یہاں تک کہ تم پر فجر کی سفید دھاری (رات کی) سیاہ دھاری سے نمایاں ہو جائے، پھر رات تک

روزے کو پورا کرو اور جب تم مساجد میں اعتکاف کی حالت میں ہو تو اپنی بیویوں سے مباشرت نہ کرو، یہ اللہ کی مقرر کردہ حدود ہیں، ان کے قریب نہ جاؤ، اس طرح اللہ اپنی آیات لوگوں کے لیے بیان کرتا ہے تاکہ وہ تقویٰ اختیار کریں۔

تشریح کلمات

الرَّفَثُ:(ر ف ث) ہم بستری یا شہوانی فعل یعنی مطلق جنسی عمل سے مربوط ہر قول و فعل جس کا ذکر نامناسب ہو۔

تَخۡتَانُوۡنَ:(خ و ن) تم سب خیانت کرتے ہو۔

عٰکِفُوۡنَ:(ع ک ف) ایک جگہ عبادت کے لیے بیٹھنے والے۔

تفسیر آیات

شان نزول: ابتدائے اسلام میں ماہ مبارک رمضان کے دنوں میں رات کو سونے سے پہلے کھانا کھا سکتے تھے۔ اگر کوئی شخص سو جاتا پھر بیدار

ہو جاتا تواس کے لیے کھانا پینا حرام تھا نیز رمضان کی راتوں میں اپنی بیویوں سے مباشرت کرنا بھی حرام تھا، لیکن لوگ اس حکم میں خیانت کرتے تھے۔

اس آیت میں نیا حکم صادرفرمایا:

۱۔ روزوں کی راتوں میں بیویوں سے مباشرت کرنا جائز ہے: فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْہُنَّ ... ۔

۲۔ فجر کی سفید دھاری نمایاں ہونے تک رات کو کھانا پینا حلال ہے: وَ کُلُوْا وَ اشْرَبُوْا ....

۳۔ روزے کی مدت فجرسے رات تک مقررکر دی گئی: اَتِمُّوا الصِّیَامَ اِلَی الَّیْلِ ....

مرد و زن: عورتیں مردوں کے لیے لباس ہیں، اسی طرح مرد بھی عورتوں کے لیے لباس ہیں۔ جس طرح دونوں کا مقام، اہمیت اور ضرورت کے لحاظ سے یکساں ہے، اسی طرح دونوں کے لیے تعبیر بھی یکساں ہے۔ اس ارشاد میں لطافت ملاحظہ فرمائیں کہ میاں بیوی ایک دوسرے کے لیے لباس ہیں اور لباس کی خصوصیات یہ ہیں :

۱۔ لباس جسم کے لیے زیب و زینت کا باعث ہے۔

۲۔ لباس انسان کے لیے ساتر اور بدن کو چھپانے کاسامان ہے۔

۳۔ لباس سے انسان کا جسم محفوظ رہتا ہے۔

۴۔ لباس اور جسم میں نہایت قریبی ربط ہے اور ان کے درمیان کسی شے کا فاصلہ نہیں۔

۵۔ لباس انسان کے لیے باعث سکون ہے ۔

اور یہی خصوصیات میاں بیوی کے درمیان بھی موجود دہیں کہ دونوں ایک دوسرے کے لیے زیب و زینت اور عزت کا باعث ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کی ستر پوشی کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو منحرف اور سرکش ہونے سے محفوظ رکھتے ہیں ۔دونوں میں ارتباط بھی اس قدر نزدیک ہے کہ اور کوئی شے ان کے درمیان حائل نہیں ہو سکتی نیز میاں بیوی کو ایک دوسرے سے سکون بھی میسر آتا ہے۔

طلوع فجر: فجر کے معنی ’’شگاف‘‘ کے ہیں۔ صبح کی سفیدی رات کے سیاہ پردے کو چاک کر

دیتی ہے، اس لیے ا سے فجر کہتے ہیں۔ اسی طرح غروب کے وقت تاریکی دن کی روشنی پر غالب آ جائے تو اسے شفق کہتے ہیں۔

رات کے آخری حصے میں پہلے نسبتاً ہلکی سفیدی ظاہر ہوتی ہے، تھوڑی ہی دیر کے بعد یہ سفیدی ختم ہو جاتی ہے۔ اسے صبح کاذب کہتے ہیں۔ اس کے تھوڑی دیر بعد ایک روشنی عمودی شکل میں ظاہر ہو تی ہے، پھر یہی روشنی افق پر مستطیل شکل میں ایک سفید دھاری کی طرح پھیل جاتی ہے۔ یہ فجر یا صبح صادق ہے۔ چونکہ اب یہ روشنی سورج کی روشنی سے متصل ہونے کی وجہ سے سورج کے آنے کی سچی خبر دیتی ہے، اس لیے اسے فجر صادق کہتے ہیں۔

اعتکاف: جامع مسجد میں عبادت کے لیے بیٹھنا اعتکاف کہلاتا ہے۔اعتکاف ایک بڑی بافضیلت

عبادت ہے، خصوصاً رمضان کے آخری عشرے مینزیادہ فضیلت ہے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم رمضان کے آخری عشرے میں اعتکاف میں بیٹھتے تھے ۔ یہ کم ازکم تین دنونپرمشتمل ہوتا ہے۔ اعتکاف میں دن کو روزہ رکھنا شرط ہے اور صرف ضرورت کے لیے مسجد سے باہر جا سکتے ہیں۔

روزے کی راتوں میں عورتوں سے مباشرت کے جواز کے اعلان سے اس خیال کا ذہن میں آنا ایک طبعی امر تھا کہ اعتکاف کی راتوں میں بھی عورتوں سے مباشرت جائز ہو گی۔ اس خیال کو ختم کرنے کے لیے فرمایا: اعتکاف کی حالت میں اپنی بیویوں سے مباشرت نہ کرو۔

اہم نکات

۱۔ روزے کی راتوں میں ترک مباشرت کا حکم اٹھا لیا جانا احکام کے سہل ہونے کی دلیل ہے

۲۔ اللہ کی مقررکردہ حدود کی رعایت تقویٰ کانقطہ آغاز ہے: فَلَا تَقۡرَبُوۡہَا ؕ کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ اٰیٰتِہٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّہُمۡ یَتَّقُوۡنَ ۔

تحقیق مزید: تفسیر القمی ۱ : ۶۶، الکافی ۴ : ۹۸، العیاشی ۱: ۸۳

جسم

وَ نُنَزِّلُ مِنَ الۡقُرۡاٰنِ مَا ہُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحۡمَۃٌ لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ۙ وَ لَا یَزِیۡدُ الظّٰلِمِیۡنَ اِلَّا خَسَارًا﴿سورہ الاسراء آیت ۸۲﴾

اور ہم قرآن میں سے ایسی چیز نازل کرتے ہیں جو مومنین کے لیے تو شفا اور رحمت ہے لیکن

ظالموں کے لیے تو صرف خسارے میں اضافہ کرتی ہے۔

تفسیر آیات

اہل ایمان اگرچہ ایمان کی منزل پر فائز ہیں تاہم بعض اخلاقی اور روحانی بیماریوں سے بھی دوچار رہتے ہیں۔ جاہ پرستی، خوش پرستی، مال دولت سے محبت، حسد اور کینہ جیسی بیماریوں میں مبتلا رہتے ہیں اور کبھی ایمان کے ساتھ شک اور ایمان میں اضطراب آ جاتا ہے۔

ایسی بیماریوں کے لیے قرآن شفا فراہم کرتا ہے۔ قرآن کی تلاوت اور براہین و دلائل کی شیرینی روحانی و اخلاقی بیماریوں کی تلخی کو دور کر دیتی ہے۔ قرآن کا صحیح مطالعہ کرنے سے انسانی نفس کو جلا ملتی ہے اور نفس انسانی میں موجود رذائل کا ملبہ ہٹا دیا جاتا ہے جسے علم اخلاق کی اصطلاح میں تخلیہ کہتے ہیں۔

ملبہ ہٹنے کے بعد زمین ایک جدید اور کامل عمارت کے لیے ہموار ہو جاتی ہے اور نفس انسانی میں رحمت الٰہی کے شامل حال ہونے کی اہلیت آ جاتی ہے۔ اسی لیے پہلے شفا اور اس کے بعد رحمت کی نوبت آ جاتی ہے اور نفس کی بیماریوں سے جو کچھ ہاتھ سے دیا تھا وہ سب رحمت کی وجہ سے واپس مل جاتا ہے اور مزید نعمتیں ملنا شروع ہو جاتی ہیں۔

وَ لَا یَزِیۡدُ الظّٰلِمِیۡنَ اِلَّا خَسَارًا: چنانچہ رذائل کا ملبہ نہ ہٹنے کی وجہ سے ظالموں میں یہ اہلیت نہیں آتی اور رحمت خدا ان کے شامل نہیں ہوتی۔ ظاہر ہے رحمت خدا سے محرومی اور نفس کی بیماریوں میں مبتلا شخص ہر لمحہ اپنی متاع زندگی میں خسارہ اٹھاتا ہے اور قرآن کی طرف سے اتمام حجت کے بعد منکرین کا خسارہ بڑھ

جاتا ہے۔ اس طرح قرآن بہ یک وقت مؤمن کے لیے شفا و رحمت اور ظالموں کے لیے خسارے کا باعث ہے۔

امیر المومنین علی علیہ السلام سے روایت ہے:

وَ شِفَائُ لَا تُخْشَی اَسْقَامُہُ ---- (نہج البلاغۃ۔ خطبہ ۱۹۶)

وہ (قرآن) سراسر شفا ہے جس کے ہوتے ہوئے بیماریوں کا کھٹکا نہیں۔

دوسری جگہ فرمایا:

فَاسْتَشْفُوہُ مِنْ اَدْوَائِکُمْ وَ اسْتَعِینُوا بِہِ عَلَی لْاَوَائِکُمْ فَاِنَّ فِیہِ شِفَائُ مِنْ اَکْبَرِ الدَّائِ وَ ھُوَ الْکُفْرُ وَ النِّفَاقُ

وَ الْفَیُّ وَ الضَّلَالُ ---- (نہج البلاغۃ خطبہ ۱۷۶)اس سے اپنی بیماریوں کی شفا چاہو اور اپنی مصیبتوں پر اس سے مدد مانگواس میں کفر ونفاق اور ہلاکت و گمراہی جیسی بڑی بڑی مرضوں کی شفا پائی جاتی ہے۔

اہم نکات

۱۔ حجت خدا (قرآن) مومن کے لیے رحمت اور ظالم کے لیے خسارہ ہے۔

۲۔ یہ انسان کے ہاتھ میں ہے کہ قرآن سے شفا حاصل کرے یا اپنا خسارہ بڑھائے۔

وَ لَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا لَّقَالُوْا لَوْ لَا فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ ؕ ءَاَعْجَمِيٌّ وَّ عَرَبِيٌّ ؕ قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّ شِفَآءٌ ؕ وَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْۤ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّ هُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى ؕ

اُولٰٓئِکَ یُنَادَوْنَ مِنْ مَّکَانٍ بَعِیْدٍ(سورہ فصلت آیت ۴۴﴾ اور اگر ہم اس قرآن کو عجمی زبان میں قرار دیتے تو یہ لوگ کہتے کہ اس کی آیات کو کھول کر بیان کیوں نہیں کیا گیا؟ (کتاب) عجمی اور (نبی) عربی؟ کہدیجئے: یہ کتاب ایمان لانے والوں کے لیے ہدایت اور شفا ہے اور جو ایمان نہیں لاتے ان کے کانوں میں بھاری پن (بہرا پن) ہے اور وہ ان کے لیے اندھا پن ہے، وہ ایسے ہیں جیسے انہیں دور سے پکارا جاتا ہو۔

تفسیر آیات

۱۔ کبھی مشرکین کی طرف سے یہ سوال بھی آیا تھا کہ اس قرآن کو کسی اور زبان میں کیوں نہیں اتارا گیا؟ صرف عربی میں نازل کرنے کی کیا وجہ ہے؟فرمایا:

اگر یہ قرآن غیر عربی زبان میں اتارتا تو تم نے ضرور کہنا تھا کہ مرسل الیہ عربی اور اس نبی

کی قوم بھی عربی ہے، اسے پیغام کسی عجمی زبان میں کیوں مل رہا ہے؟ ایک غیر مفہوم زبان میں ہم سے بات کرنے کا کیا مقصد ہے؟

قرآن نے دیگر مقامات پر فرمایا ہے:

فَاِنَّمَا یَسَّرۡنٰہُ بِلِسَانِکَ... (۱۹ مریم:۹۷)(اے رسول!) پس ہم نے یہ قرآن آپ کی زبان میں یقینا آسان کیا ہے۔

وَ مَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوۡمِہٖ..... (۱۴ ابراہیم: ۴)ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اسی قوم کی زبان میں۔

تاکہ وہ انہیں وضاحت سے بات سمجھا سکے۔

۲۔ قُلۡ ہُوَ لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا: یہ قرآن اہل ایمان کے لیے مینار ہدایت اور ان میں موجود کفر و شرک اور ہر قسم کی قلبی بیماری کے لیے شفا ہے۔

۳۔ وَ الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ: اور ایمان کی روشنی سے محروم لوگوں کے لیے یہ قرآن مؤثر نہیں ہے تو اس کی وجہ ان میں اہلیت نہ ہونا ہے۔ نہ ان میں کچھ سننے کی صلاحیت ہے، نہ کچھ دیکھنے کی۔

۴۔ اُولٰٓئِکَ یُنَادَوۡنَ مِنۡ مَّکَانٍ بَعِیۡدٍ: قرآن ان کے لیے دور سے آنے والی آواز کی طرح ہے۔ جہاں آواز آ رہی ہوتی ہے مگر سمجھ میں نہیں آتی۔

موت

اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ۚ وَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ الطَّاغُوۡتِ فَقَاتِلُوۡۤا اَوۡلِیَآءَ الشَّیۡطٰنِ ۚ اِنَّ کَیۡدَ الشَّیۡطٰنِ کَانَ ضَعِیۡفًا﴿سورہ نساء آیت ۷۶﴾ایمان لانے والے اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور کفار طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں پس تم شیطان کے حامیوں سے لڑو (مطمئن رہو کہ) شیطان کی عیاریاں یقینا ناپائیدار ہیں۔

تفسیر آیات

کفر و ایمان کے تقابل کے ساتھ اللہ اور طاغوت کا بھی تقابل ہے۔ طاغوت کی راہ میں لڑنے والوں کو شیطان کے حامی قرار دینے کے بعد ایک کلیہ بیان فرمایا کہ ان کے پیچھے شیطان کی عیاریاں کارفرما ہوتی ہیں، لیکن ایمان باللہ کے حقائق کے مقابلے میں یہ بے حقیقت عیاریاں کارآمد نہیں ہو سکتیں۔

۱۔ اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ: ایمان کا تقاضا یہی ہے کہ اللہ کی راہ میں جہاد کیا جائے۔ جس طرح کافر طاغوت کی راہ میں قتال کرتے ہیں۔

۲۔ فَقَاتِلُوۡۤا اَوۡلِیَآءَ الشَّیۡطٰنِ: شیطان کے حامیوں سے لڑو۔ چونکہ شیطان ایمان اور مؤمنوں سے ان کا حق چھیننا چاہتا ہے، لہٰذا فساد کا راستہ روکنے کے لیے لڑو۔ ان کو مؤمن بنانے کے لیے لڑنے کا حکم نہیں، جیسا کہ اسلام کے دشمنوں کا الزام ہے۔

۳۔ اِنَّ کَیۡدَ الشَّیۡطٰنِ کَانَ ضَعِیۡفًا: شیطان کی عیاریاں، جو اہل ایمان سے ایمان چھیننا چاہتی ہیں، ناپائیدار ہیں۔

اہم نکات

۱۔ مؤمنین کو اپنے بے حقیقت دشمن سے خوف نہیں کھانا چاہیے۔

قُلۡ اِنَّ الۡمَوۡتَ الَّذِیۡ تَفِرُّوۡنَ مِنۡہُ فَاِنَّہٗ مُلٰقِیۡکُمۡ ثُمَّ تُرَدُّوۡنَ اِلٰی عٰلِمِ الۡغَیۡبِ وَ الشَّہَادَۃِ فَیُنَبِّئُکُمۡ بِمَا کُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿سورہ جمعہ آیت ۸﴾ کہدیجئے: وہ موت جس سے تم یقینا گریزاں ہو اس کا تمہیں یقینا سامنا کرنا ہو گا پھر تم غیب و شہود کے جاننے والے کے سامنے پیش کیے جاؤگے پھر وہ اللہ تمہیں سب بتا دے گا جو کچھ تم کرتے رہے ہو۔

تفسیر آیات

موت ایسی اٹل حقیقت ہے جس سے کسی نبی مرسل اور مقرب فرشتوں کو بھی خلاصی ملنا ممکن نہیں ہے۔ اسی طرح قیامت کے دن اللہ کی عدالت میں اپنے اعمال کی جوابدہی کے لیے حاضر ہونا بھی اللہ کا اٹل فیصلہ ہے کہ کوئی

مجرم خواہ اس کا تعلق کسی بھی نسل اور اصل سے ہو اس جوابدہی سے مستثنیٰ نہیں ہے

احسان

وَ یُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّہٖ مِسْکِیْنًا وَّ یَتِیْمًا وَّ اَسِیْرًا﴿سورہ انسان آیت ۸﴾ اور اپنی خواہش کے باوجود مسکین، یتیم اور اسیر کو کھانا کھلاتے ہیں۔

تفسیر آیات

وَ یُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّہٖ: وفا بہ نذر کی نوعیت کی طرف اشارہ ہے کہ نذرکو پورا اس حالت میں کر رہے ہیں کہ وہ کھانا کھلاتے ہیں۔ یہ کھانا کھلانا بھی دو باتوں کی وجہ سے منفرد تھا:

الف: عَلٰی حُبِّہٖ: اپنی ذاتی شدید خواہش کے باوجود یہ اطعام عمل میں آیا۔ اس قسم کا ایثارعام حالت میں وقوع پذیر نہیں ہوتا بلکہ ایک طاقتور محرک درکار ہوتا ہے۔ وہ عشق خدا اور اخلاص در عمل کی طاقت ہے جو اہل بیت اطہار % ہی کے وجود میں پائی جا سکتی ہے۔

عَلٰی حُبِّہٖ کی ضمیر طعام کی طرف ہے کہ طعام کی خواہش کے باوجود ایثار کی وجہ سے اسے فضیلت ملی گئی۔ جیسے لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰی تُنۡفِقُوۡا مِمَّا تُحِبُّوۡنَ۔ (۳ آل عمران: ۹۲) کے تحت درجہ اس انفاق کو ملتا ہے جس میں اپنی پسند کی چیز دے دی جائے۔

ب: یہ ایثار مسکین، یتیم اور اسیر کے لیے عمل میں آیا جن کا تعلق معاشرے کے محروم ترین طبقے سے ہے اور ایثار کا محرک عشق الٰہی کے

ساتھ سائل کا مسکین، یتیم اور اسیر ہونا ہے۔ یہ ضرورت مند اور محتاج ترین ہونے کی وجہ سے ان لوگوں کے لیے قابل توجہ ہیں جو الٰہی قدروں کے حامل ہیں۔ ورنہ یہ لوگ معاشرے میں نظر اندازہوتے ہیں اور ان کا تعلق ناقابل اعتنا طبقہ سے ہوتا ہے۔

اِنَّمَا نُطۡعِمُکُمۡ لِوَجۡہِ اللّٰہِ لَا نُرِیۡدُ مِنۡکُمۡ جَزَآءً وَّ لَا شُکُوۡرًا﴿سورہ انسان آیت ۹﴾(وہ ان سے کہتے ہیں) ہم تمہیں صرف اللہ (کی رضا) کے لیے کھلا رہے ہیں، ہم تم سے نہ تو کوئی معاوضہ چاہتے ہیں اور نہ ہی شکرگزاری۔

تفسیر آیات

۱۔ نُطۡعِمُکُمۡ: اس نذر اور اس اطعام کی اللہ کے ہاں قدر و قیمت زیادہ ہونے کا سبب بیان ہو رہا ہے اور وہ سبب اس طرح اللہ کی طرف سے بیان ہو رہا ہے جیسے اہل بیت علیہم السلام اپنی زبان سے اس جملے کو جاری فرما رہے ہوں ۔یعنی اللہ تعالیٰ اہل بیت اطہار % کی نیتوں کو الفاظ میں

بیان فرما رہا ہے۔ نیت و اخلاص اہل بیت اطہار علیہم السلام کی طرف سے ہے اور اس کا اظہار اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو رہا ہے۔ یہ بہت بڑی فضیلت اور انسانی تصور سے زیادہ درجہ ہے جو اہل بیت اطہار علیہم السلام کو حاصل ہے کہ ان کا اخلاص اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف سے اپنے الفاظ میں بیان فرمایا:

۲۔ لِوَجۡہِ اللّٰہِ: ہم یہ ایثار و قربانی کی لازوال مثال صرف اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لیے کر رہے ہیں چونکہ اہل بیت اطہار علیہم السلام کو یہ معرفت سب سے زیادہ حاصل ہے کہ اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کا بہترین موقع یہی ہے کہ اپنی احتیاج بھی شدید ہو اور سائل کی محتاجی بھی شدید۔ اس موقع پر ایثار و قربانی سے کام لیا جائے اور ترجیح سائل کو دی جائے۔

۳۔ لَا نُرِیۡدُ مِنۡکُمۡ جَزَآءً وَّ لَا شُکُوۡرًا: ان کے ایثار و قربانی کے پیچھے محرک صرف اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی ہے۔ سائلین سے کسی قدردانی کی توقع نہیں ہے۔ ان کی نظر میں سائلین کی محتاجی ہے۔ ان کے کسی رد عمل پر نہیں ہے کہ وہ جزا کے طور پر اس احسان کا کوئی جواب دیں گے یا شکر گزاری کے طور پر زبانی اظہار کریں گے یا اس احسان کے بدلے وہ کوئی احسان کریں گے۔حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

مَنْ اَطْعَمَ مؤْمِناً حَتَّی یُشْبِعَہُ لَمْ یَدْرِ اَحَدٌ مِنْ خَلْقِ اللہِ مَا لَہُ مِنَ الْاَجْرِ فِی الْآخِرَۃِ لَا مَلَکٌ مَقَرَّبٌ وَ لَا نَبِیٌّ مُرْسَلٌ اِلَّا اللہُ رَبُّ الْعَالَمِینَ۔۔۔ (الکافی۔۲: ۲۰۱)جو کسی مومن کو سیر ہونے تک کھانا کھلائے تو جو آخرت میں اس کا ثواب ہے اسے نہ کوئی مقرب فرشتہ سمجھ سکے گا نہ نبی مرسل سوائے اللہ رب العالمین۔

حدیث نبوی ہے:

خَیْرُکُمْ مَنْ اَطْعَمَ الطَّعَامَ وَ اَفْشَی السَّلَامَ وَ صَلَّی وَ النَّاسُ نِیَامٌ۔ (الکافی ۴: ۵۰)تم میں بہتر وہ شخص ہے جو کھانا کھلائے، سلام کو عام کرے اور اس وقت نمازیں پڑھے جب لوگ سو رہے ہوں۔

نعمت

وَ اِنۡ تَعُدُّوۡا نِعۡمَۃَ اللّٰہِ لَا تُحۡصُوۡہَا ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَغَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ﴿سورہ نحل آیت ۱۸﴾ اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنے لگو تو انہیں شمار نہ کر سکو گے، اللہ یقینا بڑا درگزر کرنے والا، مہربان ہے۔

تفسیر آیات

اللہ کی بے پایان نعمتوں کا احاطہ یہ انسان نہیں کر سکتا۔ یہ غافل انسان تو ان نعمتوں میں سے موٹی موٹی نعمتوں کی طرف صرف اس وقت متوجہ ہوتا ہے جب اس سے یہ نعمت چھن جاتی ہے۔ اس کے باوجود اللہ غفور و رحیم ہے۔ اللہ کا غفران اور درگزر دیکھیے کہ انسان ان بے شمار نعمتوں سے مالا مال ہونے کے باوجود اللہ کے حق میں اس قدر گستاخ اور نافرمان ہوتا ہے کہ کبھی تو اللہ کے وجود ہی کا منکر ہو جاتا ہے۔ پھر بھی اللہ درگزر فرماتا ہے اور رحم کا یہ عالم ہے کہ ایسے ناشکرے انسان کو بھی برابر نعمتوں کی ارزانی فرماتا رہتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ نہایت گستاخ انسان پر بھی اللہ کی ذات نہایت مہربان ہے جو اسے بھی بے شمار نعمتیں عطا فرماتی ہے۔

ہنر

نَحۡنُ نَقُصُّ عَلَیۡکَ اَحۡسَنَ الۡقَصَصِ بِمَاۤ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ ہٰذَا الۡقُرۡاٰنَ ۫ وَ اِنۡ کُنۡتَ مِنۡ قَبۡلِہٖ لَمِنَ الۡغٰفِلِیۡنَ﴿سورہ یوسف آیت ۳﴾ ہم اس قرآن کو آپ کی طرف وحی کر کے آپ سے بہترین قصہ بیان کرنا چاہتے ہیں اور آپ اس سے پہلے (ان واقعات سے) بے خبر تھے۔

تفسیر آیات

اس قصہ کو قرآن نے احسن القصص کے ساتھ اس لیے تعبیر کیا ہے کہ اس میں متعدد کرداروں اور ان کرداروں میں سے ہر ایک کے انجام کا ذکرہے۔ پدری شفقت، آتش حسد، اسارت و غلامی کی زندگی، پرتعیش زندگی، عورت کی مکاری و عیاری، پاکدامنی و عفت کے لیے لازوال قربانی، زندانی زندگی، صرف اللہ سے امیدیں وابستہ رکھنے کی مثال، اقتدار و سلطنت پر آنے کے بعد

قدرت و تمکنت کے باوجود عفو و درگزر، حکمرانی کے آداب، عدل و انصاف کا قیام، قحط زدہ سالوں میں مشکل ترین اقتصادی امور کا حل، امور سیاست و سلطنت میں اقتصاد کی اہمیت وغیرہ کا ذکر ہے۔

اہم نکات

۱۔ اس قصے میں قرآن کی حقانیت پوشیدہ ہے۔

۲۔ اس قصے میں حسن اسلوب کا معجزہ ہے۔

وَ مِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّشۡتَرِیۡ لَہۡوَ الۡحَدِیۡثِ لِیُضِلَّ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ بِغَیۡرِ عِلۡمٍ ۟ وَّ یَتَّخِذَہَا ہُزُوًا ؕ اُولٰٓئِکَ لَہُمۡ عَذَابٌ مُّہِیۡنٌ﴿سورہ لقمان آیت ۶﴾ اور انسانوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو بیہودہ کلام خریدتے ہیں تاکہ نادانی میں (لوگوں کو) راہ خدا سے گمراہ کریں

اور اس (راہ) کا مذاق اڑائیں، ایسے لوگوں کے لیے ذلت میں ڈالنے والا عذاب ہو گا۔

شان نزول: اس آیت کے شان نزول میں روایت ہے:

نضر بن حارث تاجر تھا۔ فارس (ایران) کے علاقوں میں سفر کرتا تھا۔ وہاں کی داستانوں پر مشتمل کتاب خرید کر لاتا، انہیں قریش والوں کو سنایا کرتا اور کہتا تھا: محمد تمہیں عاد و ثمود کی داستانیں سناتا ہے اور میں تمہیں رستم و اسفند یار اور بادشاہوں کی داستانیں سناتا ہوں۔ چنانچہ لوگ قرآن کی جگہ یہ داستانیں سنا کرتے تھے۔ (مجمع البیان)

تفسیر آیات

۱۔ لَہۡوَ الۡحَدِیۡثِ: لہو ان بیہودہ باتوں کو کہتے ہیں جو انسان کو اپنی ضرورت کی باتوں سے باز

رکھے (المفردات)۔ الۡحَدِیۡثِ: خبر، حکایت، کلام کو کہتے ہیں۔ لَہۡوَ الۡحَدِیۡثِ یعنی بیہودہ باتیں۔

اس آیت میں ان لوگوں کو ذلت آمیز عذاب کی خبر دی گئی جو بیہودہ باتوں کو خرید لاتے ہیں۔
یَّشۡتَرِیۡ خریدنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ یا تو مال دے کر لَہۡوَ الۡحَدِیۡثِ خریدتے ہیں، خرافات پر مشتمل داستانیں خرید لاتے ہیں یا گلو کاروں کو معاوضہ دے کر لہویات پر مشتمل محافل جماتے ہیں یا کوئی ایسا عمل انجام دیا جاتا ہے جس سے وہ ان بیہودہ گوئیوں کو بلاتے ہیں۔

لَہۡوَ الۡحَدِیۡثِ کا ایک مصداق وہ داستانیں ہیں جن سے کلام اللہ سننے سے لوگوں کو باز رکھتے ہیں۔

لَہۡوَ الۡحَدِیۡثِ کا دوسرا اہم مصداق غنا ہے۔

غنا کی تعریف: الصوت المرجع فیہ علی سبیل اللھو و الباطل ۔ وہ اتار چڑھاؤ والی آواز جو لہو اور باطل کے طور پر نکالی جاتی ہے۔ دوسری تعریف یہ کی گئی ہے: وہ آواز جو اہل لہو و لعب کے ہاں معمول ہے۔ جیسے فلمی گانے۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے:

الْغِنَاءُ مِمَّا وَعَدَ اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ عَلَیْہِ النَّارَ وَ تَلاَ ھَٰذِہِ الْآیِۃِ .... (الکافی ۶: ۴۳۱)غنا وہ ہے جس پر اللہ نے جہنم کی سزا رکھی ہے۔ پھر امام علیہ السلام نے اس آیت کی تلاوت فرمائی۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے اس آیت کے ذیل میں فرمایا: غنا بھی لَہْوَالْحَدِیْثِ میں شامل

ہے۔ حضرت امام رضا علیہ السلام سے بھی یہی مروی ہے۔

ایک حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

الْغِنَاءُ عُشُّ النِّفَاقِ ۔ (الکافی ۶: ۴۳۱)غنا نفاق کی آماجگاہ ہے۔

۲۔ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللهِ: ان بیہودہ باتوں کو خریدنے کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو راہ خدا سے منحرف کر کے گمراہ کیا جائے۔ یہاں سیاق آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ سَبِيْلِ اللهِ سے مراد قرآن ہے۔ بیہودہ گوئی رائج کرنے کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو قرآن سے دور کیا جائے۔

۳۔ بِغَيۡرِ عِلۡمٍ: گمراہ کرنے والوں کا کسی علم کے ساتھ تعلق نہیں ہوتا بلکہ گمراہی اور جہالت باہم مترادف ہیں۔

۴۔ وَّ يَتَّخِذَہَا ہُزُوًا: بیہودہ باتوں کا دوسرا مقصد راہ خدا سے تمسخر کرنا ہے کہ وہ بیہودہ باتیں سنا کر آیات الٰہی کا مذاق اڑاتے ہیں۔ يَتَّخِذَہَا میں ضمیر سبیل کی طرف ہے۔ سبیل مؤنث مذکر دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ (التبیان)

اہم نکات

۱۔ جو بات بھی قرآن کے مقابلے میں آئے وہ لَہۡوَ الۡحَدِيۡثِ ہے۔

اخلاق

وَ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیۡمٍ﴿سورہ قلم آیت ۴﴾ اور بے شک آپ اخلاق کے عظیم مرتبے پر فائز ہیں۔

تفسیر آیات

یہ آپ کا عظیم اخلاق ہے کہ آپ کی شان میں انتہائی نامناسب جسارت ہوتی ہے، ان تمام اہانتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے آپ کے پاس خلق عظیم ہے۔

اچھا اخلاق، اعلیٰ نفسیات کا مالک ہونے کی علامت ہے اور فکر و عقل میں اعلیٰ توازن رکھنے والا ہی اعلیٰ نفسیات کا مالک ہوتا ہے۔ خلق عظیم کا مالک ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ عقل عظیم کا مالک ہے۔ اس طرح مخلوق اول، عقل ہو یا نور محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم، بات ایک ہی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے روایت ہے:

اِنَّمَا بُعْثِتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ۔ (مستدرک الوسائل ۱۱: ۱۸۷)میں اخلاق حمیدہ کی تکمیل کے لیے مبعوث ہوا ہوں۔

لہٰذا جو ذات اخلاق حمیدہ کی تکمیل کے لیے مبعوث ہوئی ہے وہ خود اخلاق حمیدہ ہی کی تکمیل کا مظہر نہ ہو گی بلکہ الٰہی اخلاق کا بھی مظہر ہو گی۔

خُذِ الْعَفْوَ وَ اْمُرْ بِالْعُرْفِ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْجٰہِلِیْنَ﴿سورہ اعراف آیت ۱۹۹﴾(اے رسول) درگزر سے کام لیں، نیک کاموں کا حکم دیں اور جاہلوں سے کنارہ کش ہو جائیں۔

تفسیر آیات

یہ خطاب رسول کریم (ص) کو اس وقت مل رہا ہے جب آپؐ مکہ میں ہر طرف سے دشمنوں کے نرغے میں تھے اور ہر طرف سے آزار پہنچ رہا تھا۔ اس وقت اسلامی اقدار و آداب کا مظاہرہ کرنے

کا حکم ہے کہ ان کے مظالم کا مقابلہ کرنے سے گریز کریں اور درگزر کو اپنا شیوہ بنائیں۔ اس آیت میں دعوت و تبلیغ کے اہم عناصر بتائے ہیں۔

i ۔ اس دعوت کی راہ میں پیش آنے والی زیادتیوں اور عوام کے منفی رد عمل کے نتیجے میں جو مظالم توڑے جائیں گے، ان کا مقابلہ عفو و درگزر سے کیا جائے۔

ii ۔ شدائد اور تکالیف کی پرواہ کیے بغیر بھلائی کی دعوت و تبلیغ جاری رکھی جائے۔

iii ۔ جاہلوں (بے علم، نادان و سفیہانہ حرکات کے حامل لوگوں) کے ساتھ الجھنے سے پرہیز کیا جائے۔ الجھنے سے مسائل سلجھتے نہیں بلکہ

مزید پیچیدہ ہوتے ہیں اور نفرتوں میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

علم

فَتَعٰلَی اللّٰہُ الۡمَلِکُ الۡحَقُّ ۚ وَ لَا تَعۡجَلۡ بِالۡقُرۡاٰنِ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ یُّقۡضٰۤی اِلَیۡکَ وَحۡیُہٗ ۫ وَ قُلۡ رَّبِّ زِدۡنِیۡ عِلۡمًا﴿سورہ طہ آیت ۱۱۴﴾ پس وہ بادشاہ حقیقی اللہ برتر ہے اور آپ پر ہونے والی اس کی وحی کی تکمیل سے پہلے قرآن پڑھنے میں عجلت نہ کریں اور کہدیا کریں: پروردگارا میرے علم میں اضافہ فرما۔

تفسیر آیات

وہ حقیقی مالک اور واقعی بادشاہ ہے۔ اپنی مملکت میں جیسے چاہتا ہے تصرف کرتا ہے۔ البتہ اللہ کی چاہت اندھی بانٹ نہیں ہے بلکہ وہ اہل کو ہدایت

دیتا ہے نااہل کو اپنے حال پر چھوڑتا ہے۔ سرکش کوسزا دیتا ہے۔ جن و انس کی ہدایت کے لیے انبیاء بھیجتا ہے، ہدایت کی کتاب نازل کرتا ہے۔ بلند و برتر ہے وہ بادشاہ حقیقی۔

وَ لَا تَعۡجَلۡ بِالۡقُرۡاٰنِ: قرآن پڑھنے مینعجلت نہ کرو۔ وحی ختم ہونے کا انتظار کرو۔ ایک تفسیر یہ ہے کہ وحی ختم ہونے سے پہلے ہر جملے کو نزول کے ساتھ ساتھ نہ پڑھو بلکہ پہلے خاموشی سے پوری وحی سن لو اور وحی ختم ہونے کے بعد پڑھا کرو۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ چونکہ آپ ؐکے سینے میں قرآن پہلے سے موجود ہے لہٰذا وحی کی تکمیل ہونے سے پہلے آپ ؐپوری آیت پڑھ دیتے ہیں، ایسا نہ کریں۔

ان دونوں میں پہلی تفسیر زیادہ قرین حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ اسی سلسلے میں فرمایا:

لَا تُحَرِّکۡ بِہٖ لِسَانَکَ لِتَعۡجَلَ بِہٖ اِنَّ عَلَیۡنَا جَمۡعَہٗ وَ قُرۡاٰنَہٗ (۷۵ قیامت:۱۶۔۱۷)(اے نبی) آپ وحی کو جلدی (حفظ) کرنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دیں۔ اس کا جمع کرنا اور پڑھوانا یقینا ہمارے ذمے ہے۔

دوسری جگہ فرمایا:

سَنُقۡرِئُکَ فَلَا تَنۡسٰۤی (۸۷ اعلیٰ:۶)(عنقریب) ہم آپ کو پڑھائیں گے پھر آپ نہیں بھولیں گے۔

چنانچہ بعض روایات میں آیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بھولنے کے خوف سے وحی کو ساتھ ساتھ پڑھ لیتے تھے۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے نہ بھولنے کی ضمانت فراہم فرمائی ہے۔

وَ قُلۡ رَّبِّ زِدۡنِیۡ عِلۡمًا: وحی کے ذریعہ جو علم آپ کو دیا جا رہا ہے اس کے بھولنے کا خطرہ نہیں ہے۔ لہٰذا بھولنے کی فکر کی جگہ مزید علم کی فکر کرنی چاہیے۔

پروردگار میرے علم میں اضافہ کر: یہ جملہ ایک تعلیم، ایک نمونہ عمل ہے۔ آداب بندگی، ایک رہنمائی ہے۔ ایک فکر ہے کہ اس صفحہ ہستی کا موجود اول اپنے علم میں اضافے کے لیے دست سوال دراز کرتا ہے۔ یہ حصول علم کے لیے ایک اسوہ ہے۔علم کی اہمیت کے لیے ایک درس ہے۔ اللہ کے بعد اس کائنات میں سب سے زیادہ علم رکھنے والی ہستی مزید علم کے لیے سوال کرتی ہے تو بے علم لوگوں کو حصول علم کے لیے کیا کچھ نہیں کرنا چاہیے۔ اس میں آداب بندگی ہے کہ

علم خواہ کتنا ہی زیادہ کیوں نہ ہو، اللہ کے سامنے عاجزی کرنی چاہیے۔

اَمَّنۡ ہُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّیۡلِ سَاجِدًا وَّ قَآئِمًا یَّحۡذَرُ الۡاٰخِرَۃَ وَ یَرۡجُوۡا رَحۡمَۃَ رَبِّہٖ ؕ قُلۡ ہَلۡ یَسۡتَوِی الَّذِیۡنَ یَعۡلَمُوۡنَ وَ الَّذِیۡنَ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ؕ اِنَّمَا یَتَذَکَّرُ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ ﴿سورہ زمر آیت ۹﴾ (مشرک بہتر ہے) یا وہ شخص جو رات کی گھڑیوں میں سجدے اور قیام کی حالت میں عبادت کرتا ہے، آخرت سے ڈرتا ہے اور اپنے رب کی رحمت سے امید لگائے رکھتا ہے، کہدیجئے: کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے یکساں ہو سکتے ہیں؟ بے شک نصیحت تو صرف عقل والے ہی قبول کرتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ اَمَّنۡ ہُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّیۡلِ: کیا یہ شخص جو آسودہ ہوتے ہی شرک اختیار کرتا ہے اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جس کے اوصاف درج ذیل ہیں:

الف: وہ رات کے اوقات میں عبادت کرتا ہے جب لوگ سو رہے ہوتے ہیں۔ ہر قسم کی ریا کاری سے دور محض رضائے رب کے لیے عبادت کرتا ہے۔

ب: الَّيۡلِ سَاجِدًا وَّ قَآئِمًا: عبادت کی نوعیت بیان فرمائی کہ یہ عبادت سجدے اور قیام کی صورت میں بجا لاتا ہے۔ رات کی تاریکی میں، تنہائی میں حالت سجدہ میں ہو یا حالت قیام میں ہو۔

ج: يَّحۡذَرُ الۡاٰخِرَةَ: وہ آخرت کی ہولناکیوں سے خائف رہتا ہے اور کسی کوتاہی یا گناہ کے ارتکاب کی صورت میں وہ اس عذاب کا خوف دل میں رکھتا ہے جو اس گناہ کے معاف نہ ہونے کی صورت میں آخرت کے دن درپیش ہو گا۔

د: وَ یَرْجُوْا رَحْمَۃَ رَبِّہٖ: اور ساتھ امید کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ وہ خوف اور امید کے درمیان ہوتا ہے۔ خوف کی وجہ سے وہ گناہ سے بچتا ہے اور امید کی وجہ سے عبادت کرتا ہے۔ چنانچہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے آپ نے فرمایا: میرے پدر بزرگوار فرماتے تھے:

اِنَّہُ لَیْسَ مِنْ عَبْدٍ مُؤمِنٍ اِلاَّ (وَ) فِی قَلْبِہِ نُورَانِ نُورُ خِیْفَۃٍ وَ نُورُ رَجَاءٍ لَوْ وُزِنَ ھَذَا لَمْ یَزِدْ عَلَی ھَذَا وَ لوَ وُزِنَ ھَذَا لَمْ یَزِدْ عَلَی ھَذَا۔ (الکافی ۲: ۹۷)مؤمن بندے کے دل میں دو قسم کے نور ہوتے ہیں ایک خوف کا نور اور دوسرا امید کا نور اگر اس (خوف) کا وزن کیا جائے تو اس (امید) سے زیادہ نہ ہو اور اگر اس (امید) کا وزن کیا جائے تو اس (خوف) سے زیادہ نہ ہو۔

دوسری روایت میں فرمایا:

يَهْلِکُ الْمُتَّکِلُ عَلَی عَمَلِہِ و لَا یَنْجُو الْمُجْتَرِئُ عَلَی الذُّنُوبِ الْوَاثِقُ بِرَحْمَۃِ اللہِ قُلْتُ: فَمَنْ یَنْجُو؟ قَالَ: الَّذِینَ ھُمْ بَیْنَ الْخَوْفِ وَ الرَّجَاءِ کَاَنَّ قُلُوبَہُمْ فِی مِخْلَبِ طَائِرٍ شَوْقًا اِلَی الثَّوَابِ وَ خَوْفًا مِنَ الْعَذَابِ۔ (مستدرک الوسائل ۱۱: ۲۲۶)اپنے عمل پر بھروسہ کرنے والا ہلاک ہو جائے گا۔ جیساکہ اللہ کی رحمت پر بھروسہ کر کے گناہ کا ارتکاب کرنے والے کو بھی نجات نہیں ملتی۔ راوی نے پوچھا: پھر کسے نجات ملے گی؟ فرمایا: جو خوف اور امید کے درمیان ہوتے ہیں گویا ان کے دل پرندوں کے پنجے میں ہیں ثواب کے شوق اور عذاب کے خوف کی وجہ سے۔

۲۔ قُلۡ ہَلۡ یَسۡتَوِی الَّذِیۡنَ یَعۡلَمُوۡنَ: مشرک اور مؤمن کا برابر نہ ہونا ایسا ہے جیسے عالم اور جاہل برابر نہیں ہو سکتے کیونکہ اللہ کی بندگی، رازِ بندگی، آگہی سے سے مربوط ہے۔ جو راز حیات کو نہیں جانتا وہ اپنی عقل سے کام نہیں لے سکتا

اور جو عقل سے کام نہیں لیتا وہ اپنی زندگی کو معقولیت نہیں دے سکتا۔

اس آیت سے عالم کی یہ تعریف سامنے آتی ہے:

عالم وہ ہے جو ابتدا و آخر شب میں عبادت کرتا ہے۔ قیامت کا خوف اور رحمت الٰہی کی امید رکھتا ہے، خواہ اصطلاح میں وہ ان پڑھ ہی کیوں نہ ہو اور جاہل وہ ہے جس میں یہ اوصاف نہ ہوں، خواہ اصطلاح میں اسے سب سے بڑا علامہ سمجھا جاتا ہو۔

چنانچہ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے روایت ہے:

لَا یَکُونُ الرَّجُلُ مُؤْمِناً حَتّٰی یَکُونَ خَائِفاً راجیاً وَ لاَ یَکُونُ خَائِفاً رَاجِیاً حَتّٰی یَکُونَ عَالِماً لِمَا یَخَافُ وَ یَرْجُو۔ (مستدرک الوسائل ۲۲۶:۱۱)بندہ اس وقت تک مومن نہیں ہوتا جب تک خوف کرنے والا اور امید رکھنے والا نہ ہو اور خوف کرنے والا اور امید رکھنے والا نہیں ہو سکتا جب تک اس چیزکا علم نہ ہو جس سے خوف کرنا اور جس کی امید رکھنا ہے۔

حدیث میں آیا ہے۔

لاَ خَیْرَ فِی الْعَیْشِ اِلَّا لِرَجُلَیْنِ عَالِمٍ مُطَاعٍ اَوْ مُسْتَمِعٍ وَاعٍ۔ (الکافی باب صفۃ العلم ۱: ۳۳)صرف دو آدمیوں کی زندگی میں خیر ہے۔ ایک عالم جس کی بات مان لی جاتی ہو دوسرا بات سننے اور سمجھنے والا۔

قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ اس آیت میں یَعْلَمُوْنَ اور لَا یَعْلَمُوْنَ میں موازنہ ہے۔ یعنی جاننے والوں اور

نہ جاننے والوں میں موازنہ ہے۔ یہ نہیں فرمایا کس چیز کے جاننے والے۔ اگر کسی خاص چیز کے نہ جاننے والے کا ذکر ہوتا تو اسی علم کے ساتھ مخصوص ہوتا۔ چونکہ کسی کا ذکر نہیں ہے لہٰذا ہر علم کی بلا امتیاز فضیلت ہے۔ لہٰذا علم کی بمقابلہ جہالت فضیلت ہے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

تَفَکُّرُ سَاعِۃٍ خَیْرٌ مِنْ عِبَادَۃِ سَنَۃٍ (قَالَ اللّٰہُ) اِنَّمَا یَتَذَکَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ۔ (مستدرک الوسائل ۱۱: ۱۸۳)ایک گھڑی فکر سے کام لینا ایک سال کی عبادت سے بہتر ہے اللہ کا ارشاد ہے نصیحت عقل والے ہی قبول کرتے ہیں۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

النَّاسُ ثَلَاثَۃٌ عَالِمٌ وَ مُتَعَلِّمٌ وَ غُثَاءٌ۔ (الکافی ۱: ۳۴)لوگ تین قسم کے ہیں: عالم، طالب علم یا خس و خاشاک۔

فضلیت: ابن عباس سے روایت ہے: الَّذِیْنَ یَعْلَمُوْنَ سے علی علیہ السلام اور ان کے اہل بیت علیہم السلام مراد ہیں۔ وَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ سے بنی امیہ اور اُولُوا الْاَلْبَابِ سے ان کے شیعہ مراد ہیں۔ (حسکانی شواھد التنزیل ذیل آیت)

اہم نکات

۱۔ مؤمن خوف و امید کے درمیان ہوتا ہے۔

۲۔ عالم وہ ہے جو رازِ بندگی جانتا ہو۔

اہم نکات

۱۔ انسان کی پوری زندگی زِدۡنِیۡ عِلۡمًا پر مشتمل ہونی چاہیے۔

چغلخوری

وَ الَّذِیۡنَ یَنۡقُضُوۡنَ عَہۡدَ اللّٰہِ مِنۡۢ بَعۡدِ مِیۡثَاقِہٖ وَ یَقۡطَعُوۡنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰہُ بِہٖۤ اَنۡ یُّوۡصَلَ وَ یُفۡسِدُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ ۙ اُولٰٓئِکَ لَہُمُ اللَّعۡنَۃُ وَ لَہُمۡ سُوۡٓءُ الدَّارِ﴿سورہ رعد آیت ۲۵﴾اور جو لوگ اللہ کے عہد کو مضبوط باندھ لینے کے بعد توڑ دیتے ہیں اور اللہ نے جن رشتوں کو جوڑنے کا حکم دیا ہے انہیں منقطع کر دیتے ہیں اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں ایسے ہی لوگوں پر لعنت ہے اور ان کے لیے ٹھکانا بھی برا ہو گا۔

تفسیر آیات

صاحبان عقل کے مقابلے میں دنیا پرستوں کا ذکر آگیا جو عقل سے کام نہیں لیتے اور جو نیک

اعمال صاحبان عقل انجام دیتے ہیں یہ لوگ اس کے خلاف حرکتوں کا مرتکب ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ وفا بعہد کی جگہ عہد شکنی کرتے ہیں، ان رشتوں کو قطع کرتے ہیں جن کو جوڑنے کا حکم ہے اور خوف خدا، خوف عاقبت، صبر و استقامت، اقامہ نماز، راہ خدا میں انفاق اور نیکی کے ذریعے برائی کو دور کرنے کی بجائے فساد پھیلاتے ہیں۔ مذکورہ اعمال کے مقابلے میں فساد فی الارض کے ذکر سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ صاحبان عقل کے اعمال میں اصلاح فی الارض مضمر ہے۔

اہم نکات

۱۔ اعمال صالحہ سے دنیا میں اصلاح ہوتی ہے اور آخرت میں اجر ملتا ہے۔

۲۔ برے اعمال سے دنیا میں لعنت اور آخرت عذاب ملتا ہے۔

۳۔ ائمہ ہدیٰ (ع) سے قطع تعلق موجب فساد فی الارض ہے۔

وَ اقۡتُلُوۡہُمۡ حَیۡثُ ثَقِفۡتُمُوۡہُمۡ وَ اَخۡرِجُوۡہُمۡ مِّنۡ حَیۡثُ اَخۡرَجُوۡکُمۡ وَ الۡفِتۡنَۃُ اَشَدُّ مِنَ الۡقَتۡلِ ۚ وَ لَا تُقٰتِلُوۡہُمۡ عِنۡدَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ حَتّٰی یُقٰتِلُوۡکُمۡ فِیۡہِ ۚ فَاِنۡ قٰتَلُوۡکُمۡ فَاقۡتُلُوۡہُمۡ ؕ کَذٰلِکَ جَزَآءُ الۡکٰفِرِیۡنَ﴿سورہ بقرہ آیت ۱۹۱﴾اور انہیں جہاں کہیں بھی پاؤ قتل کرو اور انہیں نکالو جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا ہے اور فتنہ قتل سے بھی زیادہ برا ہے، ہاں مسجد الحرام کے پاس ان سے اس وقت تک نہ لڑو جب تک وہ وہاں تم سے نہ لڑیں، لیکن اگر وہ تم سے لڑیں تو تم انہیں مار ڈالو، کافروں کی ایسی ہی سزا ہے۔

فَاِنِ انْتَہَوْا فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ﴾سورہ بقرہ آیت ۱۹۲﴾ البتہ اگر وہ باز آجائیں تو یقینا اللہ بڑا معاف کرنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

تفسیر آیات

کلام کا رخ مشرکین مکہ کے ساتھ قتال کی طرف ہے۔ آیت کا مفہوم سمجھنے کے لیے دو نکات کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ ایک یہ کہ مسلمان اس وقت کعبہ کو اپنا قبلہ قرار دے چکے تھے۔دوسرا یہ کہ کعبہ اس وقت تک مشرکین کے قبضے میں تھا۔ ان حالات میں مسلمان حج کے لیے جاتے تو لڑائی کا چھڑ جاناایک طبعی بات نظر آرہی تھی۔ اس لیے حکم ہوا کہ مشرکین کے ساتھ جہاں مقابلہ پیش آئے، ان سے لڑا جائے اوران پر سختی کی جائے تاکہ وہ مکہ چھوڑ کر چلے جائیں۔ جس طرح ان لوگوں نے ہجرت سے قبل اور بعد از ہجرت مسلمانوں کو مکہ چھوڑنے پرمجبور کیا تھا اور صرف اسلامی نظریات و

عقائد اپنانے کے جرم میں مسلمانوں کو تشدد کا نشانہ بنایا تھا ۔

فتنہ: لفظ فتنہ کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس سے مراد آزمائش و امتحان ہے:

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنۡ یُّتۡرَکُوۡۤا اَنۡ یَّقُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا وَ ہُمۡ لَا یُفۡتَنُوۡنَ {۲۹ عنکبوت: ۱ ۔ ۲}کیا لوگوں نے یہ خیال کر رکھا ہے کہ وہ صرف اتنا کہنے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور یہ کہ وہ آزمائے نہیں جائیں گے۔

اس کے برخلاف جب یہ لفظ انسان کی طرف منسوب ہو تو اس سے فساد مراد لیا جائے گا۔

فتنہ قتل سے بدتر ہے: وہ فتنہ جو انسان سے صادر ہوتا ہے، وہ قتل سے بھی برا ہے۔ اس آیہ

شریفہ کی ترکیب سے معلوم ہوتاہے کہ جس فتنے کے مشرکین مکہ مرتکب ہوئے تھے اور جو قتل سے بھی برا عمل تھا، وہ صرف عقائد و نظریات کی وجہ سے پر امن لوگوں کو گھروں سے نکالنا اور ان کا امن و سکون چھیننا تھا۔ لہٰذا اب ایسے لوگوں کے ساتھ قتال میں کوئی مضائقہ نہیں ہے جنہوں نے قتل سے بھی بدتر جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ کیونکہ قتل سے دنیاوی زندگی کا خاتمہ ہو جاتا ہے، جب کہ فتنہ و فساد کے نتیجے میں دو جرم واقع ہوتے ہیں:

۱۔ قتل اور کشت و خون بکثرت واقع ہوتے ہیں۔

۲۔ فتنہ و فساد پھیلانے والے، دوسرے لوگوں کو حق کی راہ سے ہٹانے کی کوشش کرتے ہیں اور لوگوں تک حق کا پیغام نہیں پہنچنے دیتے۔وہ حق پرستوں کے مقابلے میں عقل و منطق کی جگہ

طاقت اور تشدد سے کام لیتے ہیں۔ لہٰذا فتنہ دنیاوی اوراخروی زندگی دونوں کے منافی جرائم کے ارتکاب کا موجب ہے۔

آیت میں بیان شدہ احکام کا خلاصہ

حکم ہوا کہ مشرکین مکہ کے ساتھ جہاں کہیں بھی مقابلہ پیش آئے جنگ کرو۔ انہیں مکہ سے نکال دو، جس طرح انہوں نے تمہیں نکالا تھا، کیونکہ مشرکین مکہ نے فتنے کا ارتکاب کیاہے جو قتل سے بھی برا عمل ہے۔ اس کے باوجود مسجد الحرام کے پاس ان سے قتال نہ کرو کیونکہ مسجد الحرام کی حرمت بہرحال ان تمام باتوں پر مقدم ہے۔ البتہ اگر مشرکین مسجد الحرام کے پاس لڑائی میں پہل کریں توجواباً تم بھی ان کے ساتھ لڑو ۔

ان تمام انسانیت سوز جرائم کے ارتکاب کے باوجود اللہ کی رحمت اس کے غضب پر مقدم ہے۔ سَبَقَتْ رَحْمَتُہٗ غَضَبَہٗ ۔ { مصباح الکفعمی ص ۱۰۵} پس وہ اگر باز آجاتے ہیں تو اللہ ان سے درگزر فرمائے گا۔

اہم نکات

۱۔ صرف عقائد و نظریات کی بنا پر، پرامن لوگوں کو ہراساں کرنا اورانہیں ظلم و تشدد کانشانہ بنانا مشرکین کاشیوہ ہے ۔

۲۔ اسلام کے اصلاحی اورتربیتی اصولوں کے مطابق فتنہ گرکو قتل کرنے میں ہی انسانیت کی بھلائی ہے۔

۳۔ مومن کی حرمت کعبہ سے بالاتر ہے۔ حرمۃ المؤمن اعظم من حرمۃ ہذہ البنیۃ ۔ (بحار الانوار ۴۷ : ۸۹)

۴۔ دشمن کی جنگی صلاحیت کو مفلوج کرنا چاہیے: وَ اقْتُلُوْہُمْ حَیْثُ ثَقِفْتُمُوْہُمْ ....

یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الشَّہْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِیْہِ ؕ قُلْ قِتَالٌ فِیْہِ کَبِیْرٌ ؕ وَ صَدٌّ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَ کُفْرٌۢ بِہٖ وَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ * وَ اِخْرَاجُ اَہْلِہٖ مِنْہُ اَکْبَرُ عِنْدَ اللّٰہِ ۚ وَ الْفِتْنَۃُ اَکْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ؕ وَ لَا یَزَالُوْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ حَتّٰی یَرُدُّوْکُمْ عَنْ دِیْنِکُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ؕ وَ مَنْ یَّرْتَدِدْ مِنْکُمْ عَنْ دِیْنِہٖ فَیَمُتْ وَ ہُوَ کَافِرٌ فَاُولٰٓئِکَ حَبِطَتْ اَعْمَالُہُمْ فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَۃِ ۚ وَ اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ ہُمْ فِیْہَا خٰلِدُوْنَ﴿سورہ بقرہ آیت ۲۱۷﴾لوگ آپ سے ماہ حرام میں لڑائی کے بارے میں پوچھتے ہیں، کہدیجئے: اس میں لڑنا سنگین برائی ہے، لیکن راہ خدا سے روکنا،

اللہ سے کفر کرنا، مسجد الحرام کا راستہ روکنا اور حرم کے باشندوں کو وہاں سے نکالنا اللہ کے نزدیک زیادہ سنگین جرم ہے اور فتنہ انگیزی خونریزی سے بھی بڑا گناہ ہے اور وہ تم سے لڑتے رہیں گے یہاں تک کہ اگر ان سے ہو سکے تو وہ تمہیں تمہارے دین سے پھیر دیں اور تم میں سے جو اپنے دین سے پھر جائے گا اور کفر کی حالت میں مرے گا ایسے لوگوں کے اعمال دنیا اور آخرت دونوں میں اکارت ہوں گے اور ایسے لوگ اہل جہنم ہیں، وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔

شان نزول

رسول خدا (ص) نے قریش کی نقل و حرکت اور ان کے ارادوں کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے عبد ا للہ بن جحش کی سربراہی میں ایک دستہ نخلہ کی طرف بھیجا،جو مکہ اور طائف کے درمیان ایک جگہ ہے۔ یہاں پہنچ کر قریش کے ایک تجارتی قافلے کے ساتھ ان کاسامنا ہوا۔ چنانچہ انہوں نے اس پر حملہ کر کے ایک آدمی

کو قتل کیا اور دو کو اسیر بنا لیا۔پھر انہیں مال سمیت مدینہ لے آئے۔ یہ واقعہ رجب کے آخری دن پیش آیا تھا اور رجب ماہ حرام ہے، اس میں جنگ کرنا حرام ہے، لیکن یہ شبہ بھی موجود رہا کہ ہو سکتا ہے کہ قتل اول شعبان میں واقع ہوا ہو اور چونکہ شعبان ماہ حرام نہیں، اس لیے جنگ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اس کے باوجود مشرکین نے مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈہ کیا کہ محمد(ص) حرمت والے مہینوں میں بھی خونریزی کرنے کو جائز سمجھتے ہیں۔ اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی، جس میں مشرکین مکہ کی ان خلاف ورزیوں کا ذکر ہے جو وہ مسلمانوں کے خلاف کرتے رہے ہیں اور جن کی برائی ماہ حرام میں لڑائی سے بھی زیادہ سنگین ہے:

۱۔ راہ خدا سے روکنا، یعنی لوگوں کو اپنی پسند کا برحق مذہب قبول کرنے کی اجازت نہ دینا اور

اس امر میں ان کی آزادی، جو ایک انسانی حق ہے، سلب کرنا۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرنا جو نہایت سنگین جرم ہے۔

۳۔ مسجد الحرام کی حرمت کو پامال کرنا۔

۴۔ مکہ کے باشندوں کو صرف عقیدہ و مذہب کی بنیاد پر وہاں سے نکال دینا جو ایک عظیم جرم ہے۔ جیساکہ کفار نے رسول خدا (ص) اور مؤمنین کو مکہ سے نکالا تھا۔

۵۔ ان کا فتنہ جو قتل و خونریزی سے بھی بدتر ہے۔

۶۔ مذہبی اور نظریاتی بنیادوں پر اپنے جرائم کا سلسلہ جاری رکھنا اور مسلمانوں کو دوبارہ کافر بنانے کی سرتوڑ کوشش کرنا۔

۷۔ آخر میں تنبیہ کی گئی کہ خبردار اگر کسی نے اپنا مذہب بدل دیا اور وہ کفر کی حالت میں مر گیا تو اس کے سارے اعمال برباد ہو جائیں گے۔

اہم نکات

۱۔ فتنہ انگیزی قتل سے بھی سنگین جرم ہے: وَ الْفِتْنَۃُ اَکْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ....

۲۔ انسانی حقوق کی پامالی، ماہ حرام کی ہتک حرمت سے زیادہ سخت ہے: قُلْ قِتَالٌ فِیْہِ کَبِیْرٌ ؕ وَ صَدٌّ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَ کُفْرٌۢ بِہٖ وَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ * وَ اِخْرَاجُ اَہْلِہٖ مِنْہُ اَکْبَرُ عِنْدَ اللّٰہِ ....

تحقیق مزید: مستدرک الوسائل ۱۱: ۴۸۔ بحار الانوار ۵۶: ۱۶۔ قصص الراوندی ص ۳۳۹

غیبت

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اجۡتَنِبُوۡا کَثِیۡرًا مِّنَ الظَّنِّ ۫ اِنَّ بَعۡضَ الظَّنِّ اِثۡمٌ وَّ لَا تَجَسَّسُوۡا وَ لَا یَغۡتَبۡ بَّعۡضُکُمۡ بَعۡضًا ؕ اَیُحِبُّ اَحَدُکُمۡ اَنۡ یَّاۡکُلَ لَحۡمَ اَخِیۡهِ مَیۡتًا فَکَرِهۡتُمُوۡهُ ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِیۡمٌ﴿سورہ الحجرات آیت ۱۲﴾ اے ایمان والو! بہت سے گمانوں سے بچو، بعض گمان یقینا گناہ ہیں اور تجسس بھی نہ کیا کرو اور تم میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کی غیبت نہ کرے، کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرے گا کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے؟ اس سے تو تم نفرت کرتے ہو اور اللہ

سے ڈرو، اللہ یقینا بڑا توبہ قبول کرنے والا، مہربان ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اجۡتَنِبُوۡا کَثِیۡرًا مِّنَ الظَّنِّ: سند اور دلیل کے بغیر کسی قسم کا موقف اختیار کرنا درست نہیں ہے۔ ظن و گمان کسی بھی موقف کی سند اور دلیل نہیں ہیں البتہ کسی ظن کو شریعت نے بطور دلیل تسلیم کیا ہے اس پر عمل کرنا ہوتا ہے۔ جیسے دو عادل گواہ کی گواہی، ایک عادل کی روایت، فقیہ جامع الشرائط کا فتویٰ وغیرہ۔

رہے وہ ظن و گمان جو لوگوں کے کردار اور ان کے نجی معاملات سے مربوط ہیں تو ایسے ظن و گمان بعض اوقات حقیقت تک رسائی کا ذریعہ نہیں بنتے۔ لہٰذا ظن و گمان پر عمل کرنے سے اجتناب کرنے کا حکم ہے۔ کَثِیۡرًا مِّنَ الظَّنِّ اس لیے فرمایا

ہو گا کہ لوگوں کے درمیان بدگمانیاں زیادہ ہوا کرتی ہیں۔

مومن کے دوسرے کے بارے میں ظن و گمان کے دو اہم مواقع ہیں:

i ۔ حسن ظن ۔ ان دونوں میں سوء ii۔ سوء ظن اور ظن یعنی بدگمانی سے اجتناب کرنے کا حکم ہے جب کہ حسن ظن کو اپنانے کا حکم ہے۔

سوء ظن: اپنے برادر مومن کے بارے میں بدگمانی سے کام نہیں لینا چاہیے۔ اسلام کی انسان ساز تعلیمات نے سختی سے بدگمانی سے منع فرمایا ہے۔ حدیث نبوی ہے:

اِیَّاکُمْ وَالظَّنَّ فَاِنَّہُ اَکْذَبُ الْحَدِیث۔ (مستدرک الوسائل ۹: ۱۴۷)تم ظن سے بچا کرو کیونکہ یہ سب سے زیادہ جھوٹی بات کرنے والا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

مُجَالَسَۃُ الْاَشْرَارِ تُورِثُ سُوءَ الظَّنِّ بِالْاَخْیَارِ۔۔۔ (مستدرک الوسائل ۔ ۸:۳۲۸)برے لوگوں کی ہمنشینی اچھے لوگوں سے بدگمانی کا سبب بنتی ہے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

اِذَا اتَّہَمَ الْمُؤْمِنُ اَخَاہُ انْمَاثَ الْاِیمَانُ مِنْ قَلْبِہِ کَمَا یَنْمَاثُ الْمِلْحُ فِی الْمَاءِ۔ (الکافی۔ ۲: ۳۶۲)جب مومن اپنے برادر مومن پر بدگمانی کر کے تہمت لگاتا ہے تو ایمان اس کے دل میں اس طرح پگھل جاتا ہے جس طرح نمک پانی میں پگلھلتا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

ضَعْ اَمْرَ اَخِیکَ عَلَی اَحْسَنَۃِ حَتَّی یَاتِیَکَ مَا یَغْلِبُکَ مَنْہُ وَ لَا تُظُنَّنَّ بِکَلِمَۃٍ خَرَجَتْ مِنْ اَخِیکَ سُوء اً وَ اَنْتَ تَجِدُ لَھَا فِی الْخَیْرِ مَحْمِلًا۔ (الکافی۔ ۲،۳۱۲)اپنے بھائی کے معاملے کو بہتر صورت پر حمل کرو اس بہتری کے خلاف دلیل آنے تک۔ اپنے بھائی کے منہ سے نکلے ہوئے جملے کے بارے میں اس وقت تک بدگمانی نہ کرو جب تک اس کے لیے بہتر صورت پر محمول کرنا ممکن ہو۔

اپنے برادر مومن کے بارے میں ہمیشہ حسن ظن رکھنا اسلامی تعلیمات میں نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ دوسروں کے بارے میں حسن ظن رکھنا اپنے باطن کی پاکیزگی کی علامت ہے۔ حسن ظن، اچھی سوچ اور اچھی خصلت کا مالک ہونے کی علامت ہے۔ حدیث نبوی ہے:

اَحْسِنُوا ظُنُونَکُمْ بِاِخْوَانِکُمْ تَغْتَنِمُوا بِهَا صَفَاءَ الْقَلْبِ وَ نَمَاءَ الطَّبْعِ۔۔۔ (مستدرک الوسائل ۹: ۱۴۵)اپنے بھائیوں کے بارے میں حسن ظن رکھو تو دلوں کی صفائی اور طبیعت میں نمو آ جاتی ہے۔

حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

حُسْنُ الظَّنِّ مِنْ اَفْضَلِ السَّجَایَا وَ اَجْزَلِ العَطَایَا۔۔۔ (مستدرک الوسائل ۱۱: ۲۵۲)حسن ظن افضل ترین خصلت ہے اور وافر ترین عنایت ہے۔

۲۔ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ: بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔ یعنی بدگمانی پر اثرات مترتب کرنا اور اس بدگمانی کی بنیاد پر کسی مومن پر الزام عائد کرنا گناہ ہے۔ مثلاً ایک شخص آپ کے جانی دشمن کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کر رہا ہے۔ اس پر یہ گمان کرنا گناہ ہے کہ وہ آپ کے خلاف باتیں سن رہا ہے۔

۳۔ وَّ لَا تَجَسَّسُوۡا: اور دوسروں کے راز جاننے کی کوشش نہ کرو۔ دوسروں کے عیوب جاننے اور ان کے نجی معاملات کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی شرعاً ممانعت ہے۔ انسان کے نجی معاملات پر جب پردہ پڑا ہوا ہے، اس پردے کو چاک کرنے کی کوشش جرم ہے کیونکہ اس تجسس سے لوگوں کا راز فاش اور وقار مجروح ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ خود ستار العیوب ہے۔ اپنے بندوں کو بھی یہ حکم دیتا ہے کہ لوگوں کی پردہ پوشی کرو، راز فاش نہ کرو اور لوگوں کی نجی زندگی میں مداخلت نہ کرو۔

البتہ اگر کوئی راز کسی شخص یا ایک خاندان کے نجی معاملے سے مخصوص نہ ہو بلکہ اس کا تعلق پورے معاشرے یا اسلامی ریاست کے لیے خطرے سے مربوط ہو تو اس صورت میں دشمنوں کے عزائم کا تجسس لازمی ہے۔

لوگوں کے نجی راز ٹٹولنے کے ناجائز اور حرام ہونے پر اس آیت کے ساتھ احادیث بھی کثرت سے موجود ہیں۔ حدیث نبوی ہے:

مَنِ اطَّلَعَ فِی بَیْتِ جَارِہِ فَنَظَرَ اِلَی عَوْرَۃِ رَجُلٍ اَوْ شَعْرِ امْرَأَۃِ اَوْ شَیْئٍ مِنْ جَسَدِھَا کَانَ حَقِیقاً عَلَی اللّٰہِ اَنْ یُدْخِلَہُ النَّارَ مَعَ الْمُنَافِقِینَ الَّذِینَ کَانُوا یَبْحَثُونَ عَوْرَاتِ الْمُسْلِمِینَ فِی الدُّنْیَا۔۔۔ (مستدرک الوسائل ۱۴: ۲۱۸)کوئی اگر اپنے ہمسایہ کے گھر جھانکتا ہے اور کسی مرد کے راز یا عورت کے بالوں یا اس کے جسم کے کسی حصے پر نظر پڑتی ہے تو اللہ اسے جہنم میں داخل کر سکتا ہے ان منافقوں کے ساتھ جو دنیا میں مسلمانوں کے راز ٹٹولتے تھے۔

حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

من تتبع عورات الناس کشف اللہ عورتہ۔ (غرر الحکم حکمت:۹۶۵۷)جو شخص لوگوں کے راز ٹٹولتا ہے اللہ تعالیٰ اس کا راز فاش کرے گا۔

۴۔ وَ لَا یَغۡتَبۡ بَّعۡضُکُمۡ بَعۡضًا: تم میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کی غیبت نہ کرے۔ حدیث نبوی میں غیبت کی یہ تعریف آئی ہے:

ھل تدرون ما الغیبۃ فقالوا اللہ و رسولہ اعلم۔ قال ذکرک اخاک بما یکرہ۔ (بحار ۷۲: ۲۲۲)کیا تم جانتے ہو غیبت کیا ہے؟ لوگوں نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ فرمایا: غیبت یہ ہے کہ تو اپنے بھائی کا ایسی باتوں کے ساتھ ذکر کرے جو اسے ناگوار گزریں۔

یعنی غیبت یہ ہے کہ انسان کسی دوسرے مومن بھائی کے کسی ایسے راز کو فاش کرے یا عیب کا ذکر کرے جس کا ذکر کرنا اسے پسند نہیں ہے۔

غیبت سے انسان کا وقار مجروح ہوتا ہے۔ ہر شخص کی زندگی میں ناہمواریاں پیش آتی ہیں۔ ان ناہمواریونمیں لغزشیں سرزد ہوتی ہیں جن سے دوسرے لوگ واقف نہیں ہوتے صرف اپنا مہربان رب واقف ہے۔ رب کی مہربانی ہے کہ وہ خود ستار العیوب ہے، اپنے بندوں سے بھی فرمایا ہے کہ وہ بھی دوسروں کے عیوب فاش نہ کریں۔

مروی ہے کہ حضرت ابوذرؓ نے پوچھا: یا رسول اللہؐ! غیبت کیا ہے؟ فرمایا:

ذکرک اخاک بما یکرہہ۔ قلت یا رسول اللہ فان کان فیہ ذاک الذی یذکر بہ۔ قال اعلم اذا ذکرتہ بما ھو فیہ فقد اغتبتہ، و اذا ذکرتہ بما لیس فیہ فقد بھتہ۔۔۔ (الامالی للطوسی ص ۵۳۷)غیبت یہ ہے کہ تو اپنے بھائی کا ایسی بات کے ساتھ ذکر کرے جو اس کو ناگوار گزرے۔ عرض کیا: اگر وہ بات اس

میں موجود ہو تو بھی؟ فرمایا اگر وہ بات موجود ہو تو یہ غیبت ہے اگر وہ بات اس میں موجود نہیں ہے تو یہ بہتان ہے۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ جو عیب و نقص انسان میں موجود ہے اس کا ذکر کرنا غیبت ہے۔ اگر وہ نقص یا گناہ جو اس سے سرزد ہوا ہے وہ دوسروں کو معلوم نہیں ہے آپ نے بیان کیا ہے تو آپ نے اس کا راز فاش کیاے جس سے اس کا وقار مجروح ہوا۔ اگر وہ نقص ایسا ہے جو راز نہیں ہے جیسے لنگڑا، اندھا، بہرا ہے تو ان عیوب کا ذکر اس مومن کی توہین اور تذلیل ہے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے یہ حدیث روایت ہے:

لِلّٰہِ عَزَّ وَ جَلَّ فِی بِلَادِہِ خَمْسُ حُرِمٍ حُرْمَۃُ رَسُولِ اللّٰہِ وَ حُرْمَۃُ آلِ رَسُولِ اللّٰہِ وَ حُرْمَۃُ کِتَابِ اللّٰہِ عَزَّ وَ جَلَّ وَ

حُرْمَۃُ کَعْبَۃِ اللّٰہِ وَ حُرْمَۃُ الْمُؤْمِنِ۔ (الکافی ۸: ۱۰۷)اللہ کے لیے زمین میں پانچ حرمتیں ہیں: رسول اللہؐ کی حرمت، آل رسول کی حرمت، کتاب اللہ کی حرمت، کعبہ کی حرمت اور مومن کی حرمت۔

حدیث نبوی ہے:

الْمُؤْمِنُ حَرَامٌ کُلُّہُ عِرْضُہُ وَ مَالُہُ وَ دَمُہُ۔ (مستدرک الوسائل ۹: ۱۳۶)فرمایا: مومن کو پوری حرمت حاصل ہے اس کے آبرو، مال اور خون سب کو حرمت حاصل ہے۔

۵۔ اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاْکُلَ لَحْمَ اَخِیْہِ مَیْتًا: غیبت اس حد تک گناہ کبیرہ اور اہانت مومن ہے جس طرح اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانا۔ اس میں دو باتیں مشترک ہیں:

مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانا اس فوت شدہ شخص کی انتہائی اہانت ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ مردہ اپنا دفاع اور صفائی پیش نہیں کر سکتا ہے۔ اسی طرح وہ غائب شخص جس کی غیبت ہو رہی ہے وہ بھی اپنی صفائی پیش نہیں کر سکتا۔

۶۔ فَكَرِهْتُمُوْهُ: مردے کا گوشت کھانے سے تو تم نفرت کرتے ہو چونکہ یہ بات تمہارے محسوسات میں ہے لیکن انسانی قدروں کو تم محسوس نہیں کرتے اور قدروں کی پامالی سے نفرت نہیں کرتے۔

درج ذیل مقامات پر غیبت حرام نہیں ہے:

i ۔ ایک شخص علی الاعلان فسق و فجور کرتا ہے۔ لہٰذا جو شخص خود سے فاش ہے اس کی حرمت نہیں ہوتی۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

اِذَا جَاهَرَ الْفَاسِقُ بِفِسْقِهِ فَلَا حُرْمَةَ لَهُ وَ لَا غِيْبَةَ۔ (وسائل الشیعۃ ۱۲: ۲۸۹)جب فاسق اپنے فسق کا کھلے بندوں ارتکاب کرے تو نہ تو اس کی حرمت ہے، نہ اس کی غیبت کرنا حرام ہے۔

ii ۔ ظالم: مظلوم کے لیے جائز ہے کہ اپنی مظلومیت کو بیان کرتے ہوئے ظالم کی برائی کرے۔

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ..... (۴ نساء: ۱۴۸)اللہ اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ کوئی (کسی کی) برملا برائی کرے، مگر یہ کہ مظلوم واقع ہوا ہو۔

iii ۔ مشورہ: مثلاً اگر کوئی رشتہ دینے یا لینے یا کسی اور معاملے میں آپ سے مشورہ طلب کرے تو اس صورت میں ان عیوب و نقائص کا ذکر جائز ہے تاکہ وہ دھوکے میں نہ پڑے۔

حدیث میں ہے:

المستشار مُوتَمَنٌ.... (وسائل الشیعۃ ۱۲: ۴۳)جس سے مشورہ طلب کیا جائے وہ امین ہے۔

iv ۔ گواہی میں جرح کا حق ہے کہ گواہ کے عادل نہ ہونے پر عدالت کے منافی امور کا ذکر جائز ہے تاکہ حقوق ضائع نہ ہو جائیں۔

v ۔ راوی پر جرح کرتے ہوئے اس کے ثقہ نہ ہونے پر دلیل دینے کے لیے ثقہ ہونے کے منافی

امور کا ذکر جائز ہے تاکہ احکام و حدود معطل نہ ہوں۔

غیبت گناہ کبیرہ: حضرت ابوذرؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

یَا اَبَا ذَرٍّ اَیَّاکَ وَ الْغِیبَۃَ فَاِنَّ الْغِیْبَۃَ اَشَدُّ مِنَ الزِّنَا۔ قُلْتُ: وَ لِمَ ذَاکَ یَا رَسُولَ اللّٰہِ؟ قَالَ: لِاَنَّ الرَّجُلَ یَزْنِی فَیَتُوبُ اِلَی اللّٰہِ فَیَتُوبُ اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ الْغِیبَۃُ لَا تُغْفَرُ حَتّٰی یَغْفِرَھَا صَاحِبُھَا۔۔۔ (الوسائل الشیعۃ۱۲: ۲۸۰)اے ابوذر! غیبت سے بچو چونکہ غیبت زنا سے بدتر ہے۔ میں نے عرض کیا: وہ کیسے یا رسول اللہ؟ فرمایا: آدمی زنا کرتا ہے پھر توبہ کرتا ہے۔ اللہ اس کی توبہ قبول فرماتا ہے اور غیبت کی بخشش نہیں ہے جب تک وہ شخص معاف نہ کرے جس کی غیبت ہوئی ہے۔

اہم نکات

۱۔ مومن کی عزت و آبرو کو وہی تحفظ حاصل ہے جو کعبۃ اللہ کو ہے۔

حسد

وَ اِذۡ قُلۡنَا ادۡخُلُوۡا ہٰذِہِ الۡقَرۡیَۃَ فَکُلُوۡا مِنۡہَا حَیۡثُ شِئۡتُمۡ رَغَدًا وَّ ادۡخُلُوا الۡبَابَ سُجَّدًا وَّ قُوۡلُوۡا حِطَّۃٌ نَّغۡفِرۡ لَکُمۡ خَطٰیٰکُمۡ ؕ وَ سَنَزِیۡدُ الۡمُحۡسِنِیۡنَ﴿سورہ بقرہ آیت ۵۸﴾اور (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے کہا تھا: اس بستی میں داخل ہو جاؤ اور فراوانی کے ساتھ جہاں سے چاہو کھاؤ اور (شہر کے) دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو جاؤ اور کہو: گناہوں کو بخش دے تو ہم تمہارے گناہ بخش دیں گے اور ہم نیکوکاروں کو زیادہ ہی عطا کریں گے۔

فَبَدَّلَ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا قَوۡلًا غَیۡرَ الَّذِیۡ قِیۡلَ لَہُمۡ فَاَنۡزَلۡنَا عَلَی الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا رِجۡزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا کَانُوۡا

يَفۡسُقُوۡنَ﴿سورہ بقرہ آیت ۵۹﴾ مگر ظالموں نے اس قول کو جس کا انہیں کہا گیا تھا دوسرے قول سے بدل دیا تو ہم نے ظالموں پر آسمان سے عذاب نازل کیا کیونکہ وہ نافرمانی کرتے رہتے تھے ۔

تشریح کلمات

الْقَرْيَةَ:(ق ر ی) بستی ، قصبہ۔ شہر کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہ لفظ قَرَی سے ماخوذ ہے، جس سے مراد ہے جمع ہونا اور ایک دوسرے کے ساتھ مل بیٹھنا۔

اس آیت میں بستی سے مراد ’’ بیت المقدس ‘‘ یا اس کے نزدیک کوئی بستی یا شہر ہے، جس پر حضرت موسیٰ (ع) یا ان کے بعد بنی اسرائیل نے قبضہ کیا تھا۔

حِطَّةٌ:(ح ط ط) گناہوں کا جھاڑنا، اترنا، بوجھ کو زمین پر رکھنا۔

غَفَر:(غ ف ر) بخش دینا، چھپانا، پر کرنا۔

خَطَايا:(خ ط ی) خطیئۃ کی جمع۔ گناہ، لغزش۔

مقصد اور ارادے سے گناہ کیا جائے تو اسی خطیئۃ اور اگر بلا ارادہ گناہ سرزد ہو تو خطا کہتے ہیں۔

رِجْزًا:(ر ج ز) عذاب، پلیدی، کڑک کی آواز۔

تفسیر آیات

چالیس سال کی سزا کاٹنے کے بعد جب انہیں اس ارض مقدس میں داخل ہونے کا حکم ملا تو ان سے صرف یہ کہا گیا کہ داخل ہوتے وقت اپنے گناہوں سے توبہ کرنا: وَّ قُوْلُوْا حِطَّۃٌ ، لیکن انہوں نے حِطَّۃٌ ’گناہ بخش دے‘ کی بجائے حِنْطَۃٌ ’گیہوں‘ کہ کر حکم خدا کا مذاق اڑایا۔

بنی اسرائیل کی زبان عبرانی تھی اور حِطَّۃٌ کا لفظ عربی ہے۔ چنانچہ ہو سکتا ہے کہ اظہار توبہ کے لیے حِطَّۃٌ کا ہم معنی لفظ کہنے کا حکم دیا گیا ہو۔

الْبَابَ سے مراد شاید بیت المقدس کا دروازہ ہو جسے آج بھی باب حطۃ کہا جاتا ہے۔

اس واقعے کی تفصیل سورئہ مائدہ آیہ ۲۰ تا ۳۶ میں آئے گی۔

اہل البیت (ع) سے مروی حدیث نبوی (ص) میں مذکور ہے:

اِنَّ عَلِیًّا سَفِیْنَۃُ نَجَاتِہَا وَ بَابُ حِطَّتِھَا ۔ {تفسیر نور الثقلین ۱ : ۸۲۔ بحار الانوار ۳۸ : ۱۱۲}بے شک علی (ع) اس امت کے لیے کشتی نجات اور باب حطہ ہیں۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے:

نَحْنُ بَابُ حِطَّتِكُمْ ۔ {نور الثقلین ۱ : ۸۳۔ بحار الانوار ۱۳ : ۱۶۸}ہم تمہارے لیے باب حطہ ہیں۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کی نعمتوں سے استفادہ کرنا منشائے خداوندی ہے۔

۲۔ مخصوص الفاظ، اجابت دعا میں مؤثر ہیں: قُوْلُوْا حِطَّۃٌ نَّغْفِرْ لَکُمْ ...

تحقیق مزید: امام علی علیہ السلام باب حطہ ہیں۔الکافی ۸ : ۲۹۔ الدرالمنثور ۱ : ۱۳۹۔ امالی الصدوق ص ۷۴۔ امالی الطوسی ص ۶۰۔امالی مفیدص ۱۴۵۔ التوحید ص ۱۶۴

نفس

اَللّٰہُ یَعۡلَمُ مَا تَحۡمِلُ کُلُّ اُنۡثٰی وَ مَا تَغِیۡضُ الۡاَرۡحَامُ وَ مَا تَزۡدَادُ ؕ وَ کُلُّ شَیۡءٍ عِنۡدَہٗ بِمِقۡدَارٍ﴿سورہ رعد آیت ۸﴾اللہ ہی جانتا ہے کہ ہر مادہ (مونث) کیا اٹھائے ہوئے ہے اور ارحام کیا گھٹاتے اور کیا بڑھاتے ہیں اور اس کے ہاں ہر چیز کی ایک (معین) مقدار ہے۔

تشریح کلمات

تَغِیۡضُ:(غ ی ض) یہ نقص کی طرح لازم و متعدی دونوں طرح آتا ہے۔ لہٰذا اس کے معنی کسی چیز کو کم کرنے یا از خود کم ہونے کے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ اَللّٰہُ یَعۡلَمُ مَا تَحۡمِلُ: اس آیت میں اللہ انسان کی تخلیق کی باریکیوں کا ذکر فرماتا ہے کہ اللہ ان باریکیوں کو جانتا ہے اور یہی دلیل ہے کہ ان کا خالق اللہ ہے۔

۲۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ ہر مادہ کیا اٹھائے ہوئے ہے۔ انسانی تجربات نے اس بات کا کھوج لگا لیا کہ ماورائے رحم، عورت کے تخم اور مرد کے نطفہ میں موجود منوی جاندار کے جفت ہونے سے نطفہ ٹھہرتا ہے۔ مرد کے نطفہ میں موجود کروڑوں منوی جانداروں میں سے صرف ایک جانور تخم میں داخل ہونے میں کامیاب ہوتا ہے۔

کا حامل ہوتا ہے یا ایکس Yباپ کا منوی حیوان کا حامل ہوتا (Xکا اور ماں کا تخم صرف ((X(کے ساتھ جفت (Xماں کے ((Yہے۔ اگر باپ کا (ماں Xہو جائے تو لڑکا پیدا ہو گا اور اگر باپ کا کے ساتھ جفت ہوگیا تو لڑکی پیدا ہو گی۔ Xکے

اس کا بھی پتہ چلاہے کہ ایک سینٹی میٹر مکعب نطفے میں ایک سو ملین منوی جاندار موجود

ہوتے ہیں۔ ان میں سے صرف 500 منوی جاندار تخم تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں اور ان میں سے صرف ایک منوی جاندار تخم کے اندر داخل ہونے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ یہ بھی معلوم کر لیا گیا ہے کہ ان ایک سو ملین جانوروں میں ہر ایک کی خاصیت دوسرے سے جدا ہے لیکن:

i ۔ صرف اللہ جانتا ہے کہ ان ایک سو ملین جانوروں میں سے کون سا جانور تخم مادر میں داخل ہونے میں کامیاب ہونے والا ہے۔

ii ۔ اللہ ہی کے علم میں ہے کہ آنے والا بچہ ان ایک سو ملین خاصیتوں میں سے کس خاصیت کا مالک ہے۔

iii ۔ وہ کون سا محرک ہے جس کے تحت یہ جانور اس تخم کی طرف دوڑتے اور اس میں داخل ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔

iv ۔ انسان تو جانداروں کی کائنات میں ہر مادہ کو جاننے سے قاصر ہے۔ وہ کیسے جان سکتا ہے کہ ہر مادہ کیا اٹھانے والی ہے؟ اگر جدید انکشافات کے ذریعے بعض جانداروں کے رحم کا کچھ جزئی حال معلوم کر لیا گیا ہے تو بھی ہر مادہ کے رحم کا حال جاننے سے انسان قاصر ہے۔ لہٰذا یہ اعتراض سرے سے وارد ہی نہ ہو گا کہ رحم کا کچھ حال تو انسان بھی جاننے لگے ہیں۔

۳۔ رحم کے عمل کو اللہ ہی جانتا ہے کہ کن چیزوں میں کمی پیدا کر دیتا ہے اور کن چیزوں میں اضافہ کرتا ہے۔

ممکن ہے اس کا مطلب یہ ہو کہ رحم میں جنین کی پرورش کرنے کے لیے بعض چیزوں میں کمی اور بعض چیزوں میں اضافے کی ضرورت ہوتی ہے اور نطفہ ٹھہرنے کے بعد رحم یہ کام انجام دیتا ہے۔ جنین کی تربیت و پرورش کے لیے رحم کی فعالیت نہایت حیرت انگیز ہے جو اہل مطالعہ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ ممکن یہ فعالیت تَغِیّضُ اور تَزَّدَادُ بعض مواد میں کمی اور بعض مواد میں اضافے پر مشتمل ہو۔ اس موضوع پر تفصیل کے لیے رجوع فرمائیں: الطب محراب للایمان ۔

بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد مدت حمل میں کمی اور زیادتی ہے۔ امام مالک کے نزدیک زیادہ سے زیادہ مدت حمل پانچ سال ہے۔ (ان کو چاہیے بچے کی پیدائش کے فوراً بعد اسے سکول بھیجنے کے لیے کتابیں، بستہ تیار رکھیں) ۔ شافعی کے نزدیک چار سال اور ابو حنیفہ کے نزدیک دو سال ہے۔ تجرباتی اعداد و شمار کے

مطابق جنین ماں کے شکم میں ۳۰۸ دن سے زیادہ نہیں رہ سکتا۔ فقہ جعفریہ کے مطابق بعض فقہاء کے نزدیک یہ مدت ۹ ماہ، بعض کے نزدیک دس ماہ اور بعض کے نزدیک ایک سال ہے۔ اس سے زیادہ نہیں ہے۔

۴۔ وَ کُلُّ شَیۡءٍ عِنۡدَہٗ بِمِقۡدَارٍ: اللہ کا کائناتی نظام اندھی بانٹ نہیں، مقدر شدہ نظام ہے اور ہر چیز کے حدود اربعہ کا تعین پہلے سے ہے۔ وَ کُلُّ شَیۡءٍ ۔ کائنات میں ہر شیء کا تعین اور اسی کی تشکیل، عناصر کی ترکیب سے ہوتی ہے اور وہ شیء کے لیے معین ہے۔ اس معین مقدار سے کم یا زیادہ ہونے کی صورت میں وہ چیز نہیں بنے گی۔

اہم نکات

۱۔ مخلوقات کی باریکیوں کا علم، دلیل خالقیت ہے۔

۲۔ حمل اور رحم ، مظاہر قدرت الٰہی ہیں۔

۳۔ رحم جن چیزوں میں کمی اور اضافہ کرتا ہے وہ اللہ کے مقررہ نظام کے تحت ہے: وَ کُلُّ شَیۡءٍ عِنۡدَہٗ بِمِقۡدَارٍ ۔

غصّہ

اَلَاۤ اِنَّ اَوۡلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ﴿سورہ یونس آیت ۶۲﴾سنو!جو اولیاء اللہ ہیں انہیں نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ وہ رنجیدہ ہوں گے۔
الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ کَانُوۡا یَتَّقُوۡنَ ﴿سورہ یونس آیت ۶۳﴾ جو ایمان لائے اور تقویٰ پر عمل کیا کرتے تھے۔
لَہُمُ الۡبُشۡرٰی فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَ فِی الۡاٰخِرَۃِ ؕ لَا تَبۡدِیۡلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰہِ ؕ ذٰلِکَ ہُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ ﴿سورہ یونس آیت

﴿۶۴﴾ ان کے لیے دنیا کی زندگی میں بھی بشارت ہے اور آخرت میں بھی، اللہ کے کلمات میں تبدیلی نہیں آ سکتی، یہی بڑی کامیابی ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اللہ تعالیٰ جب اپنے خاص بندوں کا ذکر فرماتا ہے تو پورے اہتمام کے ساتھ پہلے توجہ مبذول کراتا ہے: اَلَآ سنو! آگاہ رہو! اس کے بعد مضمون شروع ہو جاتا ہے۔

۲۔ اولیائے خدا کو نہ کوئی خوف لاحق ہو گا، نہ وہ رنجیدہ ہوں گے۔ ولی الولاء والتوالی کے اصل معنی بقول راغب اصفہانی یہ ہیں: دو یا دو سے زیادہ چیزوں کا اس طرح یکے بعد دیگرے آنا کہ ان کے درمیان کوئی ایسی چیز نہ آئے جو ان میں سے نہ ہو۔ آگے لکھتے ہیں : الوِلایۃ (بکسر واؤ) کے معنی تصرف، اور الوَلایۃ (بفتح واؤ) کے معنی کسی کا متولی ہونے کے ہیں۔ اس تشریح کے

مطابق ولی کا اصل معنی تولیت و حاکمیت ہے، پھربطور استعارہ دیگر مختلف معانی میں استعمال ہوا ہے۔ اللہ رسول اور امام جب لوگوں کے ولی ہوتے ہیں تو تولیت و حاکمیت کے معنوں میں ہوتا ہے: اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ الَّذِيْنَ ۔۔۔ (۵ مائدہ: ۵۵)

جب کوئی ہستی اللہ کی ولی بن جاتی ہے تو ولایت کے چند ایک آثاراور اللہ کے ولی کے لیے چند باتیں اس آیہ شریفہ میں ثابت فرمائی ہیں :

۱۔ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ: انہیں کوئی خوف نہیں ہو گا۔ یہاں لَا خَوْفٌ مطلق ذکر ہوا ہے۔ اس لیے دنیاوی و اخروی دونوں شامل ہے۔ اللہ کے ولی کے دل میں ہمیشہ یہ خوف رہتا ہے کہ کہیں آداب بندگی میں خلل نہ آئے۔ کہیں کوئی ایسا عمل سرزد نہ ہو جو اپنے حقیقی محبوب ذات باری تعالیٰ کے لیے پسند

نہ ہو۔ یہ خوف ولی اللہ کو جہاں تمام گناہوں سے محفوظ رکھتا ہے، وہاں دوسرے تمام خوف سے نجات دلاتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا:

یٰمُوۡسٰی لَا تَخَفۡ ۫ اِنِّیۡ لَا یَخَافُ لَدَیَّ الۡمُرۡسَلُوۡنَ (۲۷ نمل: ۱۰)اے موسیٰ! ڈریے نہیں ، بے شک میرے حضور مرسلین ڈرا نہیں کرتے۔

اولیاء اللہ وہ ہوتے ہیں جو غیر خدا سے نہیں ڈرتے۔ وہ کیوں ڈریں۔ ان کی ساری زندگی اپنے محبوب کے لیے ہے اور اگر یہ زندگی چلی جاتی ہے تو وہ اپنے محبوب کی بارگاہ میں پہنچ جاتے ہیں۔ لہٰذا ولی اللہ موت سے بھی نہیں ڈرتے:

قُلۡ یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ ہَادُوۡۤا اِنۡ زَعَمۡتُمۡ اَنَّکُمۡ اَوۡلِیَآءُ لِلّٰہِ مِنۡ دُوۡنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الۡمَوۡتَ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ﴿﴾ (۶۲ جمعۃ: ۶)کہدیجیے: اے یہودیت اختیار کرنے والو!

اگر تمہیں یہ زعم ہے کہ تم اللہ کے چہیتے ہو دوسرے لوگ نہیں تو موت کی تمنا کرو اگر تم سچے ہو۔

ولی اللہ عاشق خدا ہوتا ہے اور اپنے رب کی ملاقات کا اشتیاق رکھتا ہے۔ ولی اللہ اس اشتیاق کے تحت لقائے رب کی منزل پانے پر کہہ اٹھتا ہے:

فزت وربّ الکعبۃ ۔ (امیرالمؤمنین علیہ السلام۔ بحار الانوار ۲۰: ۱۴۷)رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا۔

۲۔ وَ لَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ: وہ رنجیدہ اورغمگین نہیں ہوتے۔ ولی اللہ کو کوئی مادی اور دنیاوی بات رنجیدہ نہیں کرسکتی۔ وہ رنجیدہ کیوں ہو کیونکہ وہ تو ہمیشہ اپنے آپ کو کامیاب دیکھتا ہے۔ اس کی زندگی کی متاع

رضائے رب ہے۔ ولی اللہ کا نعرہ ہوتا ہے:

ما ذا وجد من فقدک و ما الذی فقد من وجدک ---- (حضرت امام حسین علیہ السلام۔ دعائے عرفہ۔ بحار الانوار ۹۵: ۲۲۶)اے اللہ جس نے تجھے کھویا اس نے کیا پایا اور جس نے تجھے پایا اس نے کیا کھویا۔

ولی اللہ اپنی زندگی میں اللہ کو پانے کے بعد کچھ بھی نہیں کھو دیتا تو وہ رنجیدہ کس بات کے لیے ہو۔ آخرت میں بھی کوئی رنج نہیں ہو گا۔ یہ تو واضح ہے محب کو محبوب کے پاس کوئی حزن و ملال نہیں ہوا کرتا:

فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ--- (۳ آل عمران: ۱۷۰)اللہ نے اپنے فضل سے جو کچھ انہیں دیا ہے اس پر وہ خوش ہیں----

۳۔ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا: یہ اولیاء اللہ ایمان کے ایک خاص درجہ پر فائز ہیں ، ورنہ وہ ایمان جو کبھی شرک کے ساتھ آلودہ رہا ہو، انسان کو مقام ولایت پر فائز نہیں کر سکتا۔ ایمان کے اس خاص رتبہ پر فائز ہونے کے بعد انسان اپنے آپ کو کاملاً اللہ کے حوالہ کر دیتا ہے اور اللہ ہی کو کل کا مالک مان لیتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے آپ کو کسی چیز کا حتیٰ اپنی جان کا بھی مالک نہیں سمجھتا تو جب وہ مالک ہے نہیں تو کیا کھوئے گا؟ جب کوئی چیز کھو نہیں دیتا تو حزن و خوف کے لیے کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی۔

۴۔ وَ کَانُوۡا یَتَّقُوۡنَ: ماضی استمراری کے ساتھ تعبیر یہ بتاتی ہے کہ وہ تقویٰ کو ایمان کے تمام مراحل میں اپنا شعار بناتے ہیں۔

۵۔ لَہُمُ الۡبُشۡرٰی: دنیا و آخرت ددنوں میں ان کے لیے بشارت ہو گی۔ دنیا میں بشارت کا مطلب یہ ہو گا کہ انہیں کامیابی کی خوشخبری دی جاتی ہے اور آخرت میں ثواب و رضائے رب کی صورت میں ہو گی۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

مؤمن کی روح جب سینے تک پہنچ جاتی ہے تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھتا ہے اور آپؐ فرماتے ہیں :میں رسول اللہ ہوں۔ تجھے بشارت ہو۔ پھر فرمایا: علی بن ابی طالب ؑکو دیکھے گا اورآپؑ فرمائیں گے: میں علی بن ابی طالب ہوں جس سے تو محبت کرتا تھا۔ آج تیرے کام آؤں گا۔ (الکافی ۳: ۳۳ باب ما یعابن المؤمن و الکافر)

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے صحابی حضرت ابو بصیر راوی ہیں :

میرا ایک ہمسایہ حکومت وقت کا حامی تھا۔ اس کے پاس وافر دولت آگئی۔ وہ مئے نوشی کی محفلیں جماتا تھا جس سے مجھے بڑی اذیت ہوتی تھی۔ میں نے کئی بار خود اس سے شکایت کی لیکن وہ باز نہ آیا اور ان باتوں کا اس پر اثر نہ ہوا۔ ایک دن اس نے کہا:

میں تو اس گندگی میں مبتلا ہوں آپ سالم ہیں۔ اگر آپ اپنے صاحب (مولا) سے میرا تعارف کراتے تو ممکن ہے آپ کے ذریعے اللہ مجھے بچا لیتا۔ اس بات کا مجھ پر اثر ہوا۔ جب میں حضرت ابو عبد اللہ (امام جعفر صادق علیہ السلام) کی خدمت میں حاضر ہوا تو ان سے اس شخص کا حال بیان کیا۔ آپ نے فرمایا:

جب کوفہ واپس جاؤ تو وہ تمہارے پاس آئے گا۔ اس سے کہنا کہ جعفر بن محمد علیہما السلام کہتے ہیں جس چیز کا تو ارتکاب کر رہا ہے اس کو ترک کر دو۔ میں اللہ کے حضور تیرے لیے جنت کا ضامن بنتا ہوں۔

جب میں کوفہ واپس آیا تو دیگر آنے والوں میں یہ بھی میرے پاس آیا۔ میں نے اسے روک رکھا۔ جب خلوت ہوئی تو میں نے اس سے کہا:

میں نے جعفر بن محمد الصادق علیہ السلام سے تیرا ذکر کیا تھا تو آپ ؑنے فرمایا: جب کوفہ واپس جاؤ تو وہ تمہارے پاس آئے گا۔ اس سے کہنا جعفر بن محمد علیہما السلام کہتے ہیں کہ جس چیز کا تو ارتکاب کر رہا ہے اسے ترک کرو۔ میں اللہ کے حضور تیرے لیے جنت کا ضامن بنوں گا۔

یہ سن کر وہ رویا اور پوچھا: بخدا کیا ابو عبداللہ نے فرمایا ہے؟

میں نے قسم کھائی ایسا ہی فرمایا ہے۔ اس نے کہا: بس کافی ہے اور چلا گیا۔ کچھ دنوں بعد اس نے مجھے بلایا۔ دیکھتا ہوں وہ اپنے گھر کے عقب میں عریاں بیٹھا ہے اور کہا:

اے ابوبصیر! گھر میں کچھ نہ رہا۔ میں نے سب کچھ نکال دیا اور میرا یہ حال ہو گیا۔

ابوبصیر کہتے ہیں :

میں نے دوستوں سے کچھ کپڑے جمع کر کے اسے پہنائے۔ ابھی چند دن گزرے تھے کہ اس نے

مجھے بلایا اور کہا کہ میں مریض ہو گیا ہوں۔ میں اس کا معالجہ کراتا رہا یہاں تک اس کی موت نزدیک آگئی۔ حالت نزع میں اس کے پاس بیٹھا تھا۔ اس پر غشی طاری ہو گئی۔ ہوش میں آکر کہنے لگا:

اے ابو بصیر قد وفی صاحبک لنا ۔ آپ کے صاحب (مولا) نے میرے ساتھ اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ پھر اس کی روح پرواز کر گئی۔

حج کے موقع پر میں نے حضرت ابو عبد اللہ علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے اجازت طلب کی۔ میں ابھی آپ ؑگھر میں داخل ہو رہا تھا۔ میرا ایک پاؤں صحن میں اور دوسرا پاؤں دروازے کی چوکھٹ پر تھا۔ آپ ؑنے فرمایا:

اے ابو بصیر! قد وفینا لصاحبک ہم نے تیرے ساتھی کے ساتھ وعدہ پورا کر دیا۔ (الکافی ۱: ۴۷۴ باب مولد ابی عبد اللہ جعفر بن محمد ع)

’’دنیا کی زندگی میں بشارت‘‘ کے سلسلے میں یہ واقعہ نہایت درس آموز ہے۔ اسی قسم کا ایک اور واقعہ الکافی ۵: ۱۰۶ میں ملاحظہ فرمائیں۔

۶۔ لَا تَبۡدِیۡلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰہِ: مذکورہ اوصاف کے حامل لوگوں کے لیے دنیا اور آخرت میں کامیابی کی بشارت دینے کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کے حتمی فیصلوں میں سے ہے۔ اس میں کسی قسم کا تغیر اور تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

۷۔ ذٰلِکَ ہُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ: ابدی کامیابی سے بڑھ کر اور کامیابی کیا ہو سکتی ہے۔

اہم نکات

۱۔ جس کے دل میں غیر خدا کا خوف ہو وہ مقام ولایت پر فائز نہیں ہو سکتا۔

۲۔ ولی خدا دنیا سے اپنی کامیابی کی بشارت لے کر جاتا ہے: لَہُمُ الۡبُشۡرٰی فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا

زبان

اَلَمۡ نَجۡعَلۡ لَّہٗ عَیۡنَیۡنِ ﴿سورہ بلد آیت ۸﴾ کیا ہم نے اس کے لیے نہیں بنائیں دو آنکھیں؟

وَ لِسَانًا وَّ شَفَتَیۡنِ ﴿سورہ بلد آیت ۹﴾ اور ایک زبان اور دو ہونٹ؟

وَ ہَدَیۡنٰہُ النَّجۡدَیۡنِ ﴿سورہ بلد آیت ۱۰﴾ اور ہم نے دونوں راستے (خیر و شر) اسے دکھائے،

تشریح کلمات

النَّجۡدَیۡنِ:(ن ج د) النجد کے معنی بلند اور سخت جگہ کے ہیں۔

تفسیر آیات

ربط کلام اس طرح ہے: جس ذات نے تمہیں بینائی عنایت کی، اظہار خیال کے لیے زبان اور ہونٹ دیے اور خیر و شر میں تمیز کرنے کی قوت عنایت کی، اس ذات کی راہ میں انفاق تو ضیاع سمجھتا ہے؟

۱۔ انسان دونوں آنکھوں سے اپنے وجود سے باہر کی دنیا کو درک کر سکتا ہے۔ بیرونی دنیا کی چیزوں کے حجم، شکل اور رنگ کو درک کر لیتا ہے۔ آنکھوں کی تخلیق اللہ تعالیٰ کی صناعیت میں ایک محیر العقول صنعت ہے اور دیگر اعضاء میں آنکھ بہت سے امتیازات کی حامل ہے کہ بڑی تیزی

سے اشیاء کی شکل، رنگ، دور نزدیک، خوبصورت یا بدشکل اور بڑی چھوٹی ہونے کو دماغ کے لیے حاضر کر دیتی ہے۔

صرف اس ظاہر بینی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان آنکھوں کے ماوراء دو بصیرت کی آنکھیں بھی عنایت فرمائیں جن سے ان قدروں کا ادراک ہوتا ہے جو چشم ظاہر نہیں دیکھ سکتی۔ وہ ہے: وَ ہَدَیۡنٰہُ النَّجۡدَیۡنِ خیر و شر کا ادراک۔

۲۔ وَ لِسَانًا: زبان ایک مختصر عضو ہے جو انسانی زندگی کے لیے متعدد خدمات انجام دیتی ہے:

۔ قوت ذائقہ اسی زبان کے ذریعے فراہم کی گئی i ہے جس سے شیرین، تلخی و ترشی کا ادراک ہوتا ہے۔

ii ۔ طعام کو دائیں بائیں دانتوں کے حوالے کرنے کے لیے چمچ کا کام دیتی ہے۔

iii ۔ حلق سے نکلنے والی آواز کو حروف کی شکل میں لانے کے لیے زبان بنیادی کردار ادا کرتی ہے اور ان حروف کو جوڑ کر کلمات پھر کلام وجود میں آتا ہے جس سے انسان بیرونی دنیا کے لیے اپنا مدعا بیان کر سکتا ہے۔

۳۔ وَّ شَفَتَیۡنِ: ہونٹ انسان کے بیرونی دنیا سے اتصال قائم کرنے کے لیے اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اس کے بند، کھول، سکڑاؤ اور پھلاؤ سے بہت سے حروف تشکیل پاتے ہیں اور کلام وجود میں آتا ہے۔ اگر زبان اور لب اللہ نے انسان کے لیے مسخر نہ کیے ہوتے تو حلق سے نکلنے والی

آواز سے حروف نہ بنتے بلکہ بیل کی آواز کی طرح رہ جاتی۔

۴۔ وَ ہَدَیۡنٰہُ النَّجۡدَیۡنِ: ہم نے دو سطح مرتفع کی راہنمائی کی ہے۔ اس سے مراد خیر و شر کا راستہ ہے۔ اسے دشوار گزار ہونے کی وجہ سے نجدین کہا ہے چونکہ خیر کی سمجھ تو آسان ہے لیکن اس کا حصول آسان نہیں ہے۔نفس کے خلاف ایک جنگ جیتنے کے بعد اس کا حصول ممکن ہے۔ شر کو خیر کے ساتھ نجد کہا ہے۔ جیسے قمر کے ساتھ سورج کو بھی قمر کہا جاتا ہے اور قمرین کہتے ہیں۔

اس آیت سے انسان کا اپنے ارادے میں خود مختار اور آزاد ہونا بھی ثابت ہے جیسے فرمایا:

وَ نَفۡسٍ وَّ مَا سَوّٰىہَا ﴿۪﴾ فَاَلۡہَمَہَا فُجُوۡرَہَا وَ تَقۡوٰىہَا ﴿۪﴾
(۹۱ شمس: ۷۔ ۸)اور (قسم ہے) نفس کی اور اس کی جس نے اسے معتدل کیا، پھر اس نفس کو اس کی بدکاری اور اس سے بچنے کی سمجھ دی۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے خیر و شیر کی راہ دکھا دی ہے۔ ان میں سے کسی ایک کو اختیار کرنا انسان کے اختیار میں ہے۔

خیر و شر کا ادراک اللہ تعالیٰ نے انسانی فطرت اور جبلت میں ودیعت فرمایا ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سورہ روم آیت ۳۰

عزت

مَنۡ کَانَ یُرِیۡدُ الۡعِزَّۃَ فَلِلّٰہِ الۡعِزَّۃُ جَمِیۡعًا ؕ اِلَیۡہِ یَصۡعَدُ الۡکَلِمُ الطَّیِّبُ وَ الۡعَمَلُ الصَّالِحُ یَرۡفَعُہٗ ؕ وَ الَّذِیۡنَ یَمۡکُرُوۡنَ السَّیِّاٰتِ لَہُمۡ عَذَابٌ شَدِیۡدٌ ؕ وَ مَکۡرُ اُولٰٓئِکَ ہُوَ یَبُوۡرُ﴿سورہ فاطر آیت ۱۰﴾ جو شخص عزت کا خواہاں ہے تو (وہ جان لے کہ) عزت ساری اللہ کے لیے ہے ، پاکیزہ کلمات اسی کی طرف اوپر چلے جاتے ہیں اور نیک عمل اسے بلند کر دیتا ہے اور جو لوگ بری مکاریاں کرتے ہیں ان کے لیے سخت عذاب ہے اور ایسے لوگوں کا مکر نابود ہو جائے گا۔

تفسیر آیات

۱۔ مَنۡ کَانَ یُرِیۡدُ الۡعِزَّۃَ فَلِلّٰہِ الۡعِزَّۃُ جَمِیۡعًا: کفار قریش کے بڑوں کو یہ خطرہ لاحق تھا کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بات بن گئی تو ہماری عزت وقار خاک میں مل جائے گی۔ دیگر لوگوں کو یہ خطرہ لاحق تھا کہ اگر ہم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لے آئے تو معاشرے میں ذلیل ہو جائیں گے۔

اس آیت میں فرمایا: پوری کی پوری عزت اللہ کی ہے۔ عزت کا سرچشمہ اللہ کی ذات ہے: مَنۡ کَانَ یُرِیۡدُ الۡعِزَّۃَ اگر کسی کو عزت چاہیے تو عزت کے سرچشمے سے ہی مل سکتی ہے۔ یہاں سے جو عزت ملے گی وہ حقیقی عزت ہو گی۔ دنیا و آخرت میں کبھی ذلت کا سامنا نہیں ہو گا۔

آج چشم جہاں دیکھ رہی ہے کہ جن ہستیوں نے شعب ابی طالب کے کربناک حالات میں وقت گزارا انہیں عزت حاصل ہے یا ان لوگوں کو عزت مل گئی جو اس وقت مکے میں دندناتے پھرتے تھے؟

۲۔ اِلَیۡہِ یَصۡعَدُ الۡکَلِمُ الطَّیِّبُ: ان باتوں کا ذکر ہے جن سے عزت حاصل ہو سکتی ہے۔ پاکیزہ کلمات اللہ کی طرف صعود کرتے ہیں۔ روایات کے مطابق پاکیزہ سے مراد وہ کلمات ہیں جو برحق عقائد و

نظریات کا اقرار کے لیے ادا کیے جاتے ہیں۔ جیسے کلمۂ توحید لا الہ اِلا اللہ اور اقرار برسالت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ولایت علی علیہ السلام کی گواہی دی جاتی ہے: علی ولی اللہ و دیگر اصول و فروع کے اقرار پر مشتمل کلمات اللہ تعالیٰ کی طرف پرواز کرتے ہیں۔ صعود سے مراد اللہ کی بارگاہ میں پیش ہوتے ہیں۔

۳۔ وَ الْعَمَلُ الصَّالِحُ یَرْفَعُہٗ: اور عمل صالح کو یہ پاکیزہ کلمات قبولیت کے درجہ تک پہنچا دیتے ہیں۔ میرے نزدیک ترتیب کلام اس طرح ہے: و العمل الصالح یرفعہ الکلم الطیب۔ چونکہ اصول عقائد کے بغیر عمل قبول نہیں ہوتا۔ لہٰذا عمل صالح کو اللہ کی بارگاہ قبولیت پر فائز کرنے کے لیے اصول عقائد کی درستگی شرط ہے۔ جیسا کہ عمل کے بغیر عقائد بے نتیجہ ہیں کیونکہ ان عقائد کی کوئی قیمت نہیں جن کا کردار پر کوئی اثر نہ ہو۔

۴۔ وَ الَّذِیۡنَ یَمۡکُرُوۡنَ السَّیِّاٰتِ: جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف بری سازشیں کر رہے ہیں انہیں شدید عذاب کا سامنا کرنا ہو گا۔

۵۔ وَ مَکۡرُ اُولٰٓئِکَ ہُوَ یَبُوۡرُ: اور ساتھ ان کی مکاریاں بے اثر ہو جائیں گی۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف ان کی ساری سازشیں ناکام ہو گئیں جیسا کہ اس آیت میں میں فرمایا:

وَ اِذۡ یَمۡکُرُ بِکَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لِیُثۡبِتُوۡکَ اَوۡ یَقۡتُلُوۡکَ اَوۡ یُخۡرِجُوۡکَ ؕ وَ یَمۡکُرُوۡنَ وَ یَمۡکُرُ اللّٰہُ ؕ وَ اللّٰہُ خَیۡرُ الۡمٰکِرِیۡنَ﴿۳۰﴾ (۸ انفال: ۳۰)اور (وہ وقت یاد کریں) جب یہ کفار آپ کے خلاف تدبیر سوچ رہے تھے کہ آپ کو قید کر دیں یا آپ کو قتل کر دیں یا آپ کو نکال دینوہ اپنی چال سوچ رہے تھے اور

اللہ اپنی تدبیر کر رہا تھا اور اللہ سب سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔

اہم نکات

۱۔ عزت کا سرچشمہ اللہ کی ذات ہے: فَلِلّٰہِ الۡعِزَّۃُ جَمِیۡعًا....

۲۔ حقیقی عزت ایمان و عمل صالح میں ہے: وَ الۡعَمَلُ الصَّالِحُ یَرۡفَعُہٗ....

۳۔ایمان اور عمل صالح میں ایک مضبوط رشتہ ہے: الۡکَلِمُ الطَّیِّبُ وَ الۡعَمَلُ الصَّالِحُ....

حق

وَ ہُوَ الۡقَاہِرُ فَوۡقَ عِبَادِہٖ وَ یُرۡسِلُ عَلَیۡکُمۡ حَفَظَۃً ؕ حَتّٰۤی اِذَا جَآءَ اَحَدَکُمُ الۡمَوۡتُ تَوَفَّتۡہُ رُسُلُنَا وَ ہُمۡ لَا یُفَرِّطُوۡنَ﴿سورہ انعام آیت ۶۱﴾ اور وہ اپنے بندوں پر غالب ہے اور تم پر نگہبانی کرنے والے بھیجتا ہے یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی ایک کو موت آ جائے تو ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) اس کی روح قبض کر لیتے ہیں اور وہ کوتاہی نہیں کرتے۔

ثُمَّ رُدُّوۡۤا اِلَی اللّٰہِ مَوۡلٰىہُمُ الۡحَقِّ ؕ اَلَا لَہُ الۡحُکۡمُ ۟ وَ ہُوَ اَسۡرَعُ الۡحٰسِبِیۡنَ﴿ سورہ انعام آیت ۶۲﴾پھر وہ اپنے مالک حقیقی اللہ کی طرف لوٹائے جائیں گے، آگاہ رہو فیصلہ کرنے کا حق صرف اسی کو حاصل ہے اور وہ نہایت سرعت سے حساب لینے والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ ہُوَ الۡقَاہِرُ: اس جملے کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو اسی سورت کی آیت ۱۸ ، جس میں فرمایا کہ اللہ اپنی قہاریت و غلبہ کی بنا پر انسانوں کی نگہبانی کے لیے فرشتے بھیجتا ہے۔

۲۔ وَ یُرۡسِلُ عَلَیۡکُمۡ حَفَظَۃً: یہ فرشتے کس چیز کی حفاظت کرتے ہیں؟ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اعمال کی کتابت و حفاظت کرتے ہیں۔ جب کہ دوسری جگہ فرمایا:

وَ اِنَّ عَلَیۡکُمۡ لَحٰفِظِیۡنَ کِرَامًا کَاتِبِیۡنَ یَعۡلَمُوۡنَ مَا تَفۡعَلُوۡنَ (۸۲ انفطار ۱۰ تا ۱۲)اور یقینا تم پر نگران مقرر ہیں۔ ایسے معزز لکھنے والے، جو تمہارے اعمال کو جانتے ہیں۔

جب کہ بعض مفسرین فرماتے ہیں: یہ فرشتے انسانوں کی مقررہ اجل تک ان کی جان کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ اس کے ساتھ موت کا ذکر اس مطلب پر قرینہ قرار دیتے ہیں۔

میرے نزدیک آیت کے اطلاق میں دونوں مفہوم کا شامل ہونا ممکن ہے۔ اعمال کی محافظت اور جان

کی بھی محافظت۔ موت کا ذکر جان کی حفاظت کا قرینہ نہیں بن سکتا، کیونکہ اعمال بھی موت سے منقطع ہوتے ہیں۔ لہٰذا جیسے موت تک جان کی حفاظت کی جاتی ہے،ایسے ہی موت تک کے اعمال کی بھی حفاظت کی جاتی ہے۔

۳۔ تَوَفَّتۡہُ رُسُلُنَا: موت پر مقرر فرشتے، جو اللہ کے بھیجے ہوئے ہوتے ہیں، انسانوں کی روح قبض کرتے ہیں۔ دوسری جگہ فرمایا:

اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الۡاَنۡفُسَ ---- (۳۹ زمر : ۴۲)موت کے وقت اللہ روحوں کو قبض کرتا ہے----

اس کو تضاد نہیں کہتے بلکہ اس امر کے سلسلہ اسباب و علل کا ذکر ہے۔ چنانچہ مثال دی جاتی ہے، خط، قلم، ہاتھ اور انسان کے ارادے سے کہ خط قلم کے ذریعے، اس کے پیچھے ہاتھ، اس کے

پیچھے انسان کا ارادہ کار فرما ہے۔ (المیزان ۷: ۱۳۲)

اسی طرح ہے کہ کسی کو ناحق قتل کیا ہے تو سربراہ مملکت، قاضی اور جلاد سب کی طرف نسبت دینا صحیح ہے۔

۴۔ رُسُلُنَا: رسل سے مراد ملک الموت کے کارندے ہو سکتے ہیں۔ جیسا کہ بعض روایات میں وارد ہے۔

ان اللہ تبارک و تعالیٰ جعل لملک الموت اعوانا من الملائکۃ ۔ (البرھان، ۲ :۴۲۷)اللہ تعالیٰ نے ملک الموت کے لیے کارندے مقرر فرمائے ہیں۔

مَوۡلٰىہُمُ الۡحَقِّ: ان کے مولائے برحق کی طرف لائے جائیں گے۔ اس میں لفظ مولا کی بڑی وضاحت آ

گئی کہ مولا وہ ہے جو ہرگو نہ تصرف کا حق رکھتا ہو، خواہ یہ تصرف ایجاد سے متعلق ہو یا تدبیر سے۔ البتہ جن ذوات کو باذن خدا ولایت کا حق ملتا ہے وہ بقدر اذن ہے۔

۵۔ اَلَا لَہُ الْحُکْمُ: انسانی زندگی سے مربوط تمام فیصلے اور موت کا فیصلہ اور موت کے بعد اس انسان کی قسمت کا فیصلہ، سب اللہ کے پاس ہے۔ کسی غیر اللہ کو اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔

اہم نکات

۱۔ وہ قیامت کے دن حساب اس طرح لے گا جس طرح دنیا میں روزی دیتا ہے اور وہ خود نظر نہیں آتا۔ (حدیث)

۲۔ اس زمین میں تمام اعمال کے انضباط کا قدرتی نظام ہے۔

۳۔ حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:
میری اجل ہی میری محافظ ہے۔

وَ خَلَقَ اللّٰہُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ بِالۡحَقِّ وَ لِتُجۡزٰی کُلُّ نَفۡسٍ بِمَا کَسَبَتۡ وَ ہُمۡ لَا یُظۡلَمُوۡنَ﴿سورہ جاشیہ آیت ۲۲﴾ اور اللہ نے آسمانوں اور زمین کو برحق خلق کیا ہے تاکہ ہر شخص کو اس کے کیے کا بدلہ دیا جائے اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ خَلَقَ اللّٰہُ: اس کائنات کو اللہ نے برحق خلق فرمایا ہے کا مطلب یہی ہے کہ بدکار اور نیک کردار ایک جیسے نہ ہوں گے۔ ہر شخص کو اس کے کیے کا نتیجہ مل جائے۔ اچھے عمل کا اچھا نتیجہ اور برے عمل کا برا نتیجہ۔ جب یہ بات دنیا

میں نہیں ہو رہی تو ایک دوسرا عالم ہونا ضروری ہے جہاں انسان کے اعمال کے نتائج سامنے آئیں۔

۲۔ وَ ہُمۡ لَا یُظۡلَمُوۡنَ: ان پر ظلم نہ ہو گا یعنی اگر اچھے اور برے عمل کا ایک ہی نتیجہ ہوا تو یہ ظلم ہو گا۔ ایسا ہرگز نہ ہو گا۔

وطن

لَا یَنۡہٰىکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیۡنَ لَمۡ یُقَاتِلُوۡکُمۡ فِی الدِّیۡنِ وَ لَمۡ یُخۡرِجُوۡکُمۡ مِّنۡ دِیَارِکُمۡ اَنۡ تَبَرُّوۡہُمۡ وَ تُقۡسِطُوۡۤا اِلَیۡہِمۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الۡمُقۡسِطِیۡنَ﴿ سورہ ممتحنہ آیت ۸﴾جن لوگوں نے دین کے بارے میں تم سے جنگ نہیں کی اور نہ ہی تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا ہے اللہ تمہیں ان کے ساتھ احسان کرنے اور انصاف کرنے سے نہیں روکتا، اللہ یقینا انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

تفسیر آیات

اس آیت میں مسلمانوں کا پرامن کافروں کے ساتھ کیا سلوک ہونا چاہیے، اس کا حکم بیان ہوا ہے۔

۱۔ لَا یَنۡہٰىکُمُ اللّٰہُ: ان سے مراد وہ مشرکین ہیں جن کے ساتھ مسلمانوں کا معاہدہ امن ہے۔

۲۔ اَنۡ تَبَرُّوۡہُمۡ وَ تُقۡسِطُوۡۤا: سے مراد ان کے ساتھ عدل و انصاف کے ساتھ معاملہ کرنا ہے۔ جیسے صلہ رحمی، حق ہمسایہ کی رعایت، مہمان نوازی، معاہدوں کی پاسداری، وفائے وعدہ، امانت کی ادائیگی، خرید و فروخت میں خیانت نہ کرنا۔

مسلمانوں کے کافروں کے ساتھ برتاؤ میں درج ذیل اصول سامنے رکھنے چاہئیں:

i ۔ صرف عقیدے کی بنیاد پر اسلام کسی شخص کے ساتھ دشمنی کرنے کا حکم نہیں دیتا، نہ ہی کافر کو بھی صرف عقیدے کی بنیاد پر دشمنی کرنے کا حق دیتا ہے اور صرف عقیدے کی بنیاد پر دشمنی کرنا، اسلام جرم سمجھتا ہے۔ ہَلۡ تَنۡقِمُوۡنَ مِنَّاۤ اِلَّاۤ اَنۡ اٰمَنَّا۔۔۔ (۵ مائدہ: ۵۹)

ii ۔ اسلام انسانی پہلو کا احترام کرتا ہے۔ ایک شخص اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ دشمنی اور زیادتی کا مجرم نہیں ہے تو وہ کافر ہونے کے باوجود انسان اور مخلوق خدا ہے۔ خود اللہ دنیا میں کافر سے اپنی نعمتیں سلب نہیں فرماتا اور کافر والدین کے لیے قرآن یہ حکم دیتا ہے:

وَ صَاحِبۡہُمَا فِی الدُّنۡیَا مَعۡرُوۡفًا۔۔۔ (۳۱ لقمان: ۱۵)البتہ دنیا میں ان کے ساتھ اچھا برتاؤ رکھنا۔

مالک اشتر کے نام عہد نامے میں حضرت علی علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپؑ اس انسانی برتاؤ کا حکم اس طرح فرماتے ہیں:

اِمَّا اَخٌ لَکَ فِی الدِّینِ وَ اِمَّا نَظِیرٌ لَکَ فِی الْخَلْقِ۔۔۔ایک تو تمہارے دینی بھائی اور دوسرے تمہارے جیسی مخلوق خدا۔

iii ۔ اسلام کسی عقیدے کو قبول یا رد کرنے میں جبر کو جائز نہیں سمجھتا۔ اسلام جہاں دین کو قبول کرنے میں جبر و اکراہ کو جائز نہیں سمجھتا وہاں اسے رد کرنے کے لیے بھی جبر کی اجازت نہیں دیتا۔ ہم نے لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ۔۔۔ (۲ بقرۃ: ۲۵۶) کے ذیل میں لکھا ہے کہ اسلام دین فطرت اور عقل و منطق کا دین ہے۔ اس فطری دعوت کے مخاطب فکر و اددراک اور عقل ہے۔ اسلامی دعوت جسم کو نہیں، عقل و ادراک کو جھنجھورتی ہے۔ اسلام طاقت کی نہیں بلکہ منطق کی زبان سے بات

کرتا ہے۔ اس کا مدعی ایمان ہے اور ایمان امر قلبی ہے۔ دل طاقت کی زبان نہیں سمجھتا۔

iv ۔ عدل و انصاف اسلام کے نزدیک ایک انسانی مسئلہ ہے جو ہر فرد کو ملنا چاہیے خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم۔ اسلامی عدالت میں فریقین برابر ہوتے ہیں۔ اگرچہ ایک فریق مسلم دوسرا فریق کافر ہو۔

ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم ان دنوں (۲۰۱۰ء) ایسے کلمہ گو لوگوں سے دوچار ہیں جو صرف اور صرف عقیدے کی بنیاد پر بے جرم پرامن کافروں کو نہیں، کلمہ گو مسلمانوں کو مسجدوں میں حالت نماز میں، بازاروں میں قتل کر رہے ہیں۔ گزشتہ چندین سال سے یہ سلسلہ جاری ہے۔ وہ ان اہم اسلامی اور انسانی قدروں کو پامال کر کے

اسے اسلامی جہاد کا نام دیتے ہیں۔ ’’برعکس نہند نام زنگی کافور‘‘

اِنَّمَا یَنۡہٰىکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیۡنَ قٰتَلُوۡکُمۡ فِی الدِّیۡنِ وَ اَخۡرَجُوۡکُمۡ مِّنۡ دِیَارِکُمۡ وَ ظٰہَرُوۡا عَلٰۤی اِخۡرَاجِکُمۡ اَنۡ تَوَلَّوۡہُمۡ ۚ وَ مَنۡ یَّتَوَلَّہُمۡ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الظّٰلِمُوۡنَ﴿سورہ ممتحنہ آیت ۹﴾ اللہ تو یقینا تمہیں ایسے لوگوں سے دوستی کرنے سے روکتا ہے جنہوں نے دین کے معاملے میں تم سے جنگ کی ہے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا ہے اور تمہاری جلاوطنی پر ایک دوسرے کی مدد کی ہے اور جو ان لوگوں سے دوستی کرے گا پس وہی لوگ ظالم ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّمَا یَنۡہٰىکُمُ اللّٰہُ: اللہ تم کو ایسے لوگوں سے محبت اور ہمدردی کرنے سے روکتا ہے جو:

i ۔ تم سے دین کے معاملے میں جنگ کرتے ہیں۔ تمہارے مسلمان ہونے کی وجہ سے تم سے جنگ کرتے ہیں۔

ii ۔ وَ اَخۡرَجُوۡكُمۡ مِّنۡ دِيَارِكُمۡ: اور تمہیں صرف دین کی بنیاد پر اپنے گھروں سے نکالتے ہیں۔

iii ۔ وَ ظٰهَرُوۡا عَلٰٓى اِخۡرَاجِكُمۡ: تمہیں بے وطن کرنے والوں کی مدد کرتے ہیں۔

ان لوگوں سے محبت کرنے کی ممانعت ہے اور ان سے محبت کرنے والے ظالم ہیں۔ ان لوگوں نے ظالموں سے ہمدردی کی ہے۔ دوسری جگہ فرمایا ہے:

وَ مَنۡ یَّتَوَلَّہُمۡ مِّنۡکُمۡ فَاِنَّہٗ مِنۡہُمۡ۔۔۔ (۵ مائدہ: ۵۱)اور تم میں سے جو انہیں حامی بناتا ہے وہ یقینا انہی میں (شمار) ہو گا۔

اہم نکات

۱۔ دشمن کا دوست دشمن ہوتا ہے۔

جوانی

وَ لَمَّا بَلَغَ اَشُدَّہٗ وَ اسۡتَوٰۤی اٰتَیۡنٰہُ حُکۡمًا وَّ عِلۡمًا ؕ وَ کَذٰلِکَ نَجۡزِی الۡمُحۡسِنِیۡنَ﴿سورہ قصص ایت۱۴﴾اور جب موسیٰ رشد کو پہنچ کر تنومند ہو گئے تو ہم نے انہیں حکمت اور علم عطا کیا اور ہم نیکی کرنے والوں کو اسی طرح جزا دیتے ہیں۔

تشریح کلمات

اَشُدَّہٗ:(ش د د) سوجھ بوجھ کی عمر کو پہنچنا اشد ہے۔ عقل و ہوشمندی کی عمر کو پہنچا۔ استوی بدنی اعتبار سے مضبوط ہونا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ لَمَّا بَلَغَ اَشُدَّہٗ: جب حضرت موسیٰ علیہ السلام عقل و ہوشمندی کی عمر کو پہنچ گئے۔ عمر کے اس حصے میں داخل ہونا جس میں انسان رشد عقل کو پہنچ جایا کرتا ہے انبیاء علیہم السلام کے لیے بھی ضروری ہے۔ البتہ یہ مسئلہ اس نبی سے مربوط ہے کہ وہ کس قسم کے معاشرے کی طرف مبعوث ہو رہا ہے ورنہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کے لیے ارشاد ہوا۔ وَ اٰتَیۡنٰہُ الۡحُکۡمَ صَبِیًّا ۔ (۹۱ مریم: ۱۲) اور ہم نے انہیں بچپن ہی سے حکمت عطا کی تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے گہوارے میں نبوت کے درجہ پر فائز ہونے کا اعلان کیا۔

۲۔ اٰتَیۡنٰہُ حُکۡمًا وَّ عِلۡمًا: ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو حکمت اور علم عطا کیا۔ پہلے بھی واضح کر چکے ہیں کہ حکمۃ واقع بینی اور صائب نظری کو کہتے ہیں۔ حکمت کے مقابلے میں خطا اور غلطی آتی ہے۔ انسان کوئی کام حکمت و صواب کے مطابق انجام دے رہا ہوتا ہے تو غلطی و اشتباہ سے محفوظ رہتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو واقع بینی کی صلاحیت دے دی۔ اس صلاحیت کے آنے پر علم عنایت فرمایا۔

۴۔ وَ کَذٰلِکَ نَجۡزِی الۡمُحۡسِنِیۡنَ: حضرت موسیٰ علیہ السلام نیکی کی اس منزل پر فائز ہو گئے جہاں سے وہ حکمت و علم کے اہل ٹھہرے۔ یہ بات ہر اس ہستی کے لیے ہے جو نیکی کی اس منزل پر فائز ہے۔

۱۔ واضح رہے حکمت و علم سے مراد نبوت نہیں ہے کیونکہ موسیٰ علیہ السلام ابھی مبعوث نہیں ہوئے۔

۲۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پرورش فرعون کے قصر میں ہوتی رہی۔شرک و کفر طغیانی و ستم کے مرکز میں پرورش پائی اس کے باوجود اس ماحول نے آپ ؑکی شخصیت، آپ کے افکار پر کوئی اثر نہیں کیا بلکہ آپؑ کے وجود میں صرف اور صرف الٰہی اقدار جا گزیں ہوئیں۔

اہم نکات

۱۔ منصب الٰہی کے لیے کمال عقلی و قوت جسمانی دونوں ضروری ہیں۔

۲۔ حکمت کا سینہ علم کا خزانہ ہوتا ہے۔

وَ دَخَلَ الۡمَدِیۡنَۃَ عَلٰی حِیۡنِ غَفۡلَۃٍ مِّنۡ اَہۡلِہَا فَوَجَدَ فِیۡہَا رَجُلَیۡنِ یَقۡتَتِلٰنِ ۟ ہٰذَا مِنۡ شِیۡعَتِہٖ وَ ہٰذَا مِنۡ عَدُوِّہٖ ۚ فَاسۡتَغَاثَہُ الَّذِیۡ مِنۡ شِیۡعَتِہٖ عَلَی الَّذِیۡ مِنۡ عَدُوِّہٖ ۙ فَوَکَزَہٗ مُوۡسٰی فَقَضٰی عَلَیۡہِ ۟ قَالَ ہٰذَا مِنۡ عَمَلِ الشَّیۡطٰنِ ؕ اِنَّہٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِیۡنٌ﴿۱۵﴾ ۱۵۔ اور موسیٰ شہر میں اس وقت داخل ہوئے جب شہر والے بے خبر تھے، پس وہاں دو آدمیوں کو لڑتے پایا، ایک ان کی قوم میں سے تھا اور دوسرا ان کے دشمنوں میں سے تھا تو جو ان کی قوم میں سے تھا اس نے اپنے دشمن کے مقابلے کے لیے موسیٰ کو مدد کے لیے پکارا تو موسیٰ نے اس (دوسرے) کو گھونسا مارا اور اس کا کام تمام کر دیا، پھر موسیٰ نے کہا: یہ تو شیطان کا کام ہو گیا، بے شک وہ صریح گمراہ کن دشمن ہے۔

تشریح کلمات

شِيۡعَتِہٖ:(ش ی ع) شیعۃ الرجل اتباعہ وانصارہ ۔ کسی شخص کی پیروی اور اس کی نصرت کرنے والوں کو اس کا شیعہ کہتے ہیں۔ (القاموس) شیعۃ الرجل اصحابہ ۔

وکز:(و ک ز) الوکز کے معنی دھکا دینے اور مکا مارنے کے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ دَخَلَ الۡمَدِیۡنَۃَ: فرعون کا قصر لب دریا، شہر سے فاصلے پر تھا۔ وہاں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام شہر میں داخل ہوئے۔

۲۔ عَلٰی حِیۡنِ غَفۡلَۃٍ مِّنۡ اَہۡلِہَا: جب شہر والے بے خبری کے عالم میں تھے۔ یہ مغرب و عشا کا درمیانی وقت تھا یا ظہر کے آرام کا وقت یا صبح کا وقت؟ اس کا تعین کرنا ممکن نہیں ہے۔ بہرحال ایک ایسا وقت تھا جس میں لوگ گھروں میں ہوا کرتے تھے۔

۳۔ فَوَجَدَ فِيۡهَا رَجُلَيۡنِ يَقۡتَتِلٰنِ: دیکھا دو شخص آپس میں لڑ رہے ہیں۔ ان دونوں میں سے ایک حضرت موسیٰ علیہ السلام کا شیعہ تھا۔ مِنۡ شِيۡعَتِهٖ یعنی ممن شایعۃ علی دینہ اپنے دین میں ان کی پیروی کرنے والا تھا۔ وسرا حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دشمن تھا۔ ان دونوں لڑنے والوں میں سے ایک اسرائیلی تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم و ملت سے ہے اور دوسرا قبطی فرعونی تھا۔ کہتے ہیں یہ فرعون کے قصر کا نانبائی تھا اور اسرائیلی کو لکڑیاں اٹھانے پر مجبور کر رہا تھا۔

اس اسرائیلی کو موسیٰ علیہ السلام کا شیعہ قرار دینے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ مصر میں اسرائیلی موسیٰ علیہ السلام کو اپنی قوم و ملت کے ایک راہنما کے طور پر جانتے تھے۔ بنی اسرائیل اگرچہ مصریوں کے ساتھ بت پرستی

کرتے تھے تاہم وہ اپنے آبا و اجداد کی طرف منسوب تھے۔ دین ابراہیمی کو مانتے تھے۔

ابن اسحاق کے مطابق بنی اسرائیل میں کچھ لوگ ایسے تھے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی باتیں سنتے اور ان کی پیروی کرتے اور ان سے ملتے رہتے تھے۔ (الکشف والبیان ۷: ۲۴۰۔ معالم التنزیل بغوی ۲: ۵۲۶)

۴۔ فَاسۡتَغَاثَہُ الَّذِیۡ مِنۡ شِیۡعَتِہٖ: موسیٰ علیہ السلام کا یہ شیعہ چونکہ مظلوم واقع ہو رہا تھا موسیٰ کو دیکھ کر اس نے مدد طلب کی۔ یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسرائیلی نے موسیٰ علیہ السلام کو مدد کے لیے کیسے پکارا جو خود فرعون کے گھر کے ایک فرد کی طرح ہیں ؟ دوسرا قبطی تو بقول بعضے اس کی روٹی پکانے والا نوکر تھا۔ موسیٰ علیہ السلام گھر کا ایک فرد تھے۔ جب گھر

کا خادم کسی بیرونی شخص سے لڑ رہا ہے تو خادم کو چاہیے تھا وہ اپنے مخدوم سے مدد طلب کرے تو کیا حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے محلات چھوڑ چکے تھے اور اسرائیلی موسیٰ علیہ السلام کو اپنے ایک راہنما کے طور پر جاننے لگے تھے؟ اگلی آیات سے اس کا کسی حد تک جواب مل سکتا ہے۔

۵۔ فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى: موسیٰ علیہ السلام نے ایک گھونسا مارا جس سے وہ قبطی فرعونی مر گیا۔ گھونسے سے عام حالات میں آدمی نہیں مرتا لیکن وہ فرعونی مر گیا۔ اس لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پریشانی ہوئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قبطی کو عمداً نہیں مارا تھا جیسا کہ بائبل کہتی ہے۔

۶۔ قَالَ ہٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ: یہ لڑائی شیطان کا کام تھا جس کے نتیجے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مداخلت کرنا پڑی اور قبطی کے قتل کی نوبت آئی۔ یہ قتل غیر مناسب وقت میں واقع ہوا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے یہ قتل ایک آزمائش بن گیا۔ منشائے خداوندی کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس آزمائشی مرحلے سے گزرنا تھا۔

اہم نکات

۱۔ اللہ اپنے برگزیدہ مرسلین کو سخت ترین آزمائشی مراحل سے گزارتا ہے۔

اِذْ اَوَی الْفِتْیَۃُ اِلَی الْکَہْفِ فَقَالُوْا رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَۃً وَّ ہَیِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا ﴿۱۰﴾ ۱۰۔ جب ان جوانوں نے غار میں پناہ لی تو کہنے لگے: اے

ہمارے پروردگار! ہمیں اپنی بارگاہ سے رحمت عنایت فرما اور ہمیں ہمارے اقدام میں کامیابی عطا فرما۔

تشریح کلمات

اَوَی:(ا و ی) اس کا مصدر الماوی ہے۔ کسی جگہ پر نزول کرنا یا پناہ حاصل کرنا۔

الْفِتْیَۃُ:(ف ت ی) الفتی کی جمع ہے جس کے معنی جوان کے ہیں۔ بطور کنایہ غلام کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

تفسیر آیات

اصحاب کہف کا واقعہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے ابو بصیر اس طرح روایت کرتے ہیں:

سورہ کہف کا شان نزول یہ ہے کہ قریش نے تین افراد نضر بن حارث بن کلدۃ اور عقبہ بن ابی معط اور عاص بن وائل کو نجران روانہ کیا تاکہ

یہودیوں سے چند مسائل سیکھ آئیں اور ان مسائل کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے سوال کیا جائے۔ وہ نجران کے علماء و یہود سے ملے انہوں نے کا:

محمد سے تین مسائل پوچھو اگر اس نے جو ہمارے علم میں ہے اس کے مطابق جواب دیا تو وہ سچا ہے اس کے بعد ایک اور مسئلہ پوچھو اگر اس کے علم کا دعویٰ کیا تو وہ جھوٹا ہے۔

کہا: وہ مسائل کیا ہیں ؟

کہا: ان سے پوچھو قدیم زمانے میں چند جوان افراد بھاگے اور غائب ہو گئے اور سو گئے۔ وہ کتنی دیر سوئے؟ ان کی تعداد کیا تھی؟ ان کے ساتھ ان کے علاوہ کیا تھا؟ اور ان کا قصہ کیا تھا؟ اور موسیٰ کے بارے میں پوچھو کہ جس عالم کی

پیروی اور ان سے علم حاصل کرنے کا اللہ نے حکم دیا تھا وہ عالم کون تھا؟ اس کی کیسے پیروی کی اور اس کا قصہ کیا تھا؟ پھر ان واقعات کو لکھوایا اور کہا جیسے ہم نے لکھوایا ہے اسی طرح جواب دیا تو وہ سچا ہے ورنہ جھوٹا ہے۔

کہا: تیسرا مسئلہ کیا ہے؟

کہا: اس سے قیامت کے بارے میں سوال کرو اگر اس نے اس بارے میں علم کا دعویٰ کیا تو وہ کاذب ہے چونکہ قیامت کا علم صرف اللہ کے پاس ہے۔

وہ مکہ لوٹے حضرت ابو طالب کے پاس آئے اور کہا

آپ کا بھتیجا یہ گمان کرتا ہے کہ میرے پاس آسمان کی خبریں آتی ہیں۔ ہم چند مسائل پوچھنے والے ہیں۔ اگر صحیح جواب دیا تو پتہ چلے گا وہ سچا ہے ورنہ وہ کاذب ہے۔

حضرت ابو طالب نے فرمایا: جو جی میں آئے پوچھ لو۔ چنانچہ ان لوگوں نے ان تین مسائل کے بارے میں پوچھا تو حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا: میں کل اس کا جواب دوں گا اور انشاء اللہ نہیں کہا۔ چالیس دن تک وحی نازل نہ ہوئی جس پر حضور غمگین ہوئے کچھ اہل ایمان شک کا شکار ہوئے۔ قریش والوں نے تمسخر کرنا شروع کیا اور حضرت ابو طالب غمگین ہوئے۔ چالیس روز کے بعد سورہ کہف نازل ہوا۔۔۔۔

مروی ہے کہ پھر حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

اصحاب کہف و رقیم ایک جابر بادشاہ کے زمانے میں تھے۔ وہ اپنے عوام کو بت پرستی کی دعوت دیتا، انکار کرنے والے کو قتل کرتا تھا۔ یہ لوگ مؤمن تھے۔ صرف اللہ کی عبادت کرتے تھے۔ بادشاہ کی طرف سے شہر کے دروازے پر پہرہ بٹھایا تھا کہ وہاں سے بتوں کو سجدہ کیے بغیر نکلنے نہیں دیتے تھے مگر یہ لوگ شکار کے بہانے نکلے، راستے میں ایک چرواہے سے ملے۔ اس نے ساتھ نہ دیا مگر اس کے کتے نے ان کا ساتھ دیا۔ وہ بھاگتے ہوئے غار تک پہنچ گئے اور کتا ان کے ساتھ تھا۔ غار میں ان پر طویل خواب مسلط کیا گیا۔ بادشاہ اور شہر والے سب ختم ہوگئے۔ زمانہ اور لوگ بدل گئے تو وہ بیدار ہوئے۔ آپس میں ایک دوسرے سے پوچھنے لگے ہم کتنی مدت سوئے ہوں گے؟ دیکھا سورج چڑھ گیا ہے لہٰذا دن کا ایک حصہ یا ایک دن سوئے ہوں گے۔ اپنے میں سے ایک فرد کو ایک

سکہ دے کر شہر کی طرف کھانے کے لیے بھیجا اور کہا: خبردار کوئی تجھے پہنچاننے نہ پائے۔ اگر ان لوگوں نے پہچان لیا تو یا تو ہمیں قتل کریں گے یا اپنا دین اختیار کرنے پر مجبور کریں گے۔ وہ شہر پہنچا تو دیکھا ہر چیز بدلی ہوئی ہے۔ حتیٰ زبان کے سمجھنے میں دقت پیش آئی۔ لوگوں نے کہا: تم کون ہو، کہاں سے آئے ہو؟ اس نے اپنے سارے حالات بتا دیے تو بادشاہ اپنے اعوان کے ساتھ نکلا اور غار کے دہانے تک پہنچ گیا....

)المیزان ذیل آیہ۔ پھر روایت کے الفاظ قرآنی تعبیرات سے متصادم ہیں کہ بادشاہ اور اس کے اعوان نے اصحاب کہف کی تعداد میں اختلاف کیا الی آخر روایت۔ اس وجہ سے ہم نے پوری روایت نقل نہیں کی ممکن ہے یہ اشتباہ راوی کی طرف سے سرزد ہوا ہو(۔

فَقَالُوۡا رَبَّنَاۤ اٰتِنَا مِنۡ لَّدُنۡکَ رَحۡمَۃً: اپنے دین کو بچانے کے لیے ہجرت اختیار کرنے کے بعد اس دعا کے لیے محل ہے کہ وہ اس ہجرت کے بعد دو باتوں کے اہل بن گئے: ایک اللہ کی رحمت، دوسری بات اس اقدام کی کامیابی کے: وَّ ہَیِّئۡ لَنَا مِنۡ اَمۡرِنَا رَشَدًا ۔

اہم نکات

۱۔ بلاد شرک سے ہجرت کرنا موحدین کی سیرت ہے۔

۲۔ راہ خدا میں عملی اقدام کے بعد دعا کی جاتی ہے: وَّ ہَیِّئۡ لَنَا مِنۡ اَمۡرِنَا رَشَدًا ۔

وَ اِذِ اعۡتَزَلۡتُمُوۡہُمۡ وَمَا یَعۡبُدُوۡنَ اِلَّا اللّٰہَ فَاۡوٗۤا اِلَی الۡکَہۡفِ یَنۡشُرۡ لَکُمۡ رَبُّکُمۡ مِّنۡ رَّحۡمَتِہٖ وَیُہَیِّئۡ لَکُمۡ مِّنۡ اَمۡرِکُمۡ

مِّرۡفَقًا﴿۱۶﴾۱۶۔ اور جب تم نے مشرکین اور اللہ کے سوا ان کے معبودوں سے کنارہ کشی اختیار کی ہے تو غار میں چل کر پناہ لو، تمہارا رب تمہارے لیے اپنی رحمت پھیلا دے گا اور تمہارے معاملات میں تمہارے لیے آسانی فراہم کرے گا۔

تشریح کلمات

الاعتزال:(ع ز ل) کے معنی ہیں کسی چیز سے کنارہ کش ہو جانا۔

مِّرۡفَقًا:(ر ف ق) نرمی و آسائش۔

تفسیر آیات

ان لوگوں نے صرف شرک کو نہیں مشرکین کو بھی چھوڑ دیا۔ مشرک معاشرے میں رہنے کو پسند نہیں کیا۔ اس راہ میں چونکہ انہوں نے اپنی عیش و آرام کی زندگی چھوڑ دی تھی تو اللہ تعالیٰ نے ان سے آرام و راحت سلب نہیں فرمایا۔ اپنی رحمتوں کے سائے میں جگہ دی اور صدیوں کی مدت تک آرام و راحت کی نیند سلا دیا۔ نیند سے

زیادہ آرام و سکون کسی چیز میں نہیں ہے کیونکہ نیند میں انسان تمام افکار سے بے نیاز ہو کر امن و سکون کی بہترین حالت میں چلا جاتا ہے۔

فَاْ وٗٓا اِلَی الْکَہْفِ: عزم و ارادہ اور امید و یقین دونوں مستحکم اور مضبوط بنیادوں پر قائم ہیں۔ غیر اللہ کو چھوڑ کر اللہ کی پناہ میں جانے کا عزم اور اللہ کی طرف سے رحمتوں کے نزول اور آسانی کی فراہمی کی امید اور یقین۔

اہم نکات

۱۔ دنیا کی آلائشوں سے کنارہ کش انسان کو امن و سکون حاصل ہو جاتا ہے۔

۲۔ صرف شرک نہیں، شرک کے معاشرے سے بھی کنارہ کش ہونا چاہیے۔

۳۔ عزم و یقین یعنی مضبوط ارادہ اور نتیجہ پر یقین، کامیابی کے دو عناصر ہیں۔

وقت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ العصر

وَ الۡعَصۡرِ کا لفظ شروع میں مذکور ہونے کے لحاظ سے اس سورہ کا نام الۡعَصۡرِ مقرر ہوا۔

یہ سورۃ مبارکہ مکی ہے اور یہ قرآن کی مختصر ترین سورتوں (الکوثر۔ قل ھو اللہ ۔ العصر) میں سے ایک ہے۔

یہ سورۃ مبارکہ نہایت مختصر ہونے کے ساتھ نہایت جامع انداز میں زندگی کی ناپائیداری، انسان کے مقصد حیات اور اسلامی تعلیمات کے بارے میں ایک جامع ترین تعبیر پر مشتمل ہے۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَ الْعَصْرِ ۙ﴿سورہ عصر آیت ۱﴾
قسم ہے زمانے کی۔
اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۙ﴿سورہ عصر آیت ۲﴾
انسان یقینا خسارے میں ہے ۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ الۡعَصۡرِ: الۡعَصۡرِ سے مراد زمانہ ہے چونکہ زمانے اور آگے والے مضمون میں ربط ہے۔ وہ ہے انسان خسارے میں ہے۔ چنانچہ انسان زمانے کے ہاتھوں خسارہ اٹھا رہا ہوتا ہے۔

اس کی تشریح کچھ اس طرح ہے کہ انسان زمانی ہے اور زمانے کی زد میں ہے۔ زمانہ انسان سے ہر لمحے اس کی زندگی کا ایک حصہ ختم کر رہا ہوتا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

نَفَسُ الْمَرْءِ خُطَاهُ اِلَی اَجَلِہٖ۔ (نہج البلاغۃ حکمت: ۷۴)انسان کی ہر سانس ایک قدم ہے جو اسے موت کی طرف بڑھائے لیے جا رہا ہے۔

ہر سانس میں انسان اپنی زندگی کا ایک حصہ اپنے ہاتھ سے دے رہا ہوتا ہے۔

کائنات میں ہر انسان کے لیے سب سے اہم چیز خود اس کی زندگی ہے۔ اگر خدا، رسول اور امام اہم ہیں تو اس لیے کہ وہ اس کا خدا، رسول اور امام ہیں۔ یعنی ان میں اس کی اپنی خودی شامل ہے۔یہ زندگی ہر آن اس کے ہاتھ سے نکلتی جا رہی ہے۔ جو اس دنیا میں اسے سب زیادہ عزیز ہے اسے ہاتھ سے دے رہا ہے اور زندگی دے کر اس کی کوئی تلافی نہیں ہو رہی۔

۲۔ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ: یہ انسان ہر آن خسارے میں ہے۔

وَ الَّذِیۡنَ ہُمۡ عَنِ اللَّغۡوِ مُعۡرِضُوۡنَ ﴿سورہ مؤمنون آیت ۳﴾

اور جو لغویات سے منہ موڑنے والے ہیں،

تشریح کلمات

اللَّغْوِ:(ل غ و) ما لا یعتد بہ بغیر سوچ و فکر کے نکلنے والی آواز کو لغو بات کہتے ہیں اور جس کا کوئی فائدہ نہ ہو اس عمل کو لغو کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ مؤمن کی جہان بینی کے تحت اپنی زندگی کے کسی بھی حصے کو لغویات میں گزارنا غیر معقول ہے۔ مؤمن کی جہاں بینی یہ ہے کہ وہ ہمیشہ باقی رہنے کے لیے آیا ہے:

انما خلقتم للبقاء لا للفناء (حضرت علی علیہ السلام کا فرمان ملاحظہ ہو امالی الصدوق : ۲۱۶)تم ہمیشہ رہنے کے لیے خلق کیے گئے ہو، نابود ہونے کے لیے نہیں۔

دنیا کی چند روزہ زندگی ابدی زندگی کے لیے تقدیر ساز ہے۔ جس مختصر اور پرُآشوب زندگی سے ابدی زندگی سنورتی ہو وہ مؤمن کے لیے بہت قیمتی ہے۔ جس زندگی کے ہر لمحے سے ابدی زندگی کے اربوں سال کی سعادت کمائی جا سکتی ہے، مؤمن ان لمحات کو لغویات میں نہیں گزارتا۔ (پوری توجہ کا طالب ہوں)

زندگی

وَ قَالَ الرَّسُوْلُ یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا ہٰذَا الْقُرْاٰنَ مَہْجُوْرًا﴿سورہ فرقان آیت ۳۰﴾ اور رسول کہیں گے: اے میرے پروردگار! میری قوم نے اس قرآن کو واقعی ترک کر دیا تھا۔

تفسیر آیات

قیامت کے دن جہاں گمراہ لوگ اپنے کیے پر نادم ہوں گے وہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بارگاہ الٰہی میں ان مجرموں کے جرم سے متعلق جو بنیادی مسئلہ اٹھائیں گے وہ قرآن کو متروک کرنا ہو گا۔ اے اللہ! جو دستور حیات آپ نے انسانوں کے لیے عنایت فرمایا تھا اسے ان لوگوں نے قابل اعتنا نہ سمجھا اور اس کی جگہ انسان کے خود ساختہ دستور پر عمل کرنے اور اس کے مطابق فیصلے کرنے کو قابل فخر سمجھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث ہے:

فَاِذَا الْتَبَسَتْ عَلَيْكُمُ الْفِتَنُ كَقِطَعِ اللَّيْلِ الْمَظْلِمِ فَعَلَيْكُمْ بِالْقُرْآنِ ---- (الکافی ۲: ۵۹۸)

فَكَيۡفَ اِذَا جِئۡنَا مِنۡ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيۡدٍ وَّ جِئۡنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيۡدًا ﴿سورہ نساء آیت ۴۱﴾۔پس (اس دن) کیا حال ہو گا جب ہم ہر امت سے ایک گواہ لائیں گے اور (اے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ کو ان لوگوں پر بطور گواہ پیش کریں گے۔

يَوۡمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا وَ عَصَوُا الرَّسُوۡلَ لَوۡ تُسَوّٰى بِهِمُ الۡاَرۡضُ ؕ وَ لَا يَكۡتُمُوۡنَ اللّٰهَ حَدِيۡثًا ﴿سورہ نساء آیت ۴۲﴾۔ اس روز کافر اور جو لوگ رسول کی نافرمانی کرتے رہے تمنا کریں گے کہ کاش (زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں دفن ہو کر) زمین کے برابر ہو جائیں اور وہ اللہ سے کوئی بات چھپا نہ سکیں گے۔

تفسیر آیات

۱۔ فَكَيۡفَ اِذَا جِئۡنَا: یعنی ہر زمانے کے رسول اپنی امت پر اللہ کی عدالت گاہ میں گواہ ہوں گے کہ پیغام الٰہی کو ان لوگوں تک پہنچا دیا۔ ان لوگوں نے اس پر عمل کیا ہو یا عصیان کیا ہو، دونوں صورتوں میں گواہی دیں گے۔

چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۔ (بحار الانوار ۱۴: ۳۳۸۔ ۵ مائدہ: ۱۱۷)میں ان پر گواہ تھا، جب تک میں ان میں تھا۔

اس سے تو معلوم ہوتا ہے انبیاء اپنے معاصر لوگوں کے اعمال پر گواہ ہوں گے۔ ممکن ہے انبیاء کے بعد ان کے اوصیاء بھی گواہ ہوں۔

۲۔ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ: ان لوگوں پر۔ اس سے مراد امت ہے تو اس کا مطلب یہ بنتا ہے کہ جس طرح ہر نبی اپنی امت کے اعمال پر گواہ ہے، اے رسول (ص) آپ ان لوگوں یعنی اس امت پر گواہ ہیں۔

بعض کے نزدیک ہٰؤُلَآءِ سے مراد ہر امت کا شہید ہے۔ اس صورت میں رسالتمآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم تمام امتوں کے گواہوں پر گواہ ہوں گے۔

حضرت امام حسین علیہ السلام سے روایت ہے:

مَا دَخَلْتُ عَلَی اَبْیِ قَطُّ اِلَّا وَجَدتہ بَاکِیاً وَقَالَ اِنَّ النَّبِی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بَکیٰ حِیْنَ وَصَلَ فِی قِرَاءَ تِہِ فَکَیْفَ اِذَا جِئنَا مِنْ کُلَّ اُمَّۃٍ بشھید و جئنا بک علی ھؤلاء شھیداً۔ فانْظُرُواْ اِلَی الشاِھَد کَیْفَ یَبْکی وَ المَشھودُ عَلَیھْمِ یَضْحَکُوْنَ (ارشاد القلوب ۱: ۹۷ باب ۲۳)میں اپنے والد گرامی کی خدمت میں جب بھی حاضر ہوا، ان کو روتے ہوئے پایا اور فرمایا: نبی کریم (ص) جب اس آیت تک پہنچ جاتے تو گریہ فرمایا کرتے تھے۔ دیکھو گواہ گریہ کرتے ہیں، جب کہ وہ لوگ گریہ نہیں کر رہے ہیں جن پر آپ (ص) گواہ ہیں۔

اعمال امت پر رسول اکرم(ص) کے شاہد ہونے کے سلسلے میں مزید تشریح کے لیے سورہ بقرہ آیت ۱۴۳ ملاحظہ فرمائیں۔

۳۔ یَوۡمَئِذٍ یَّوَدُّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا: جن لوگوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا اور رسول کی نافرمانی کی، وہ خواہش کریں گے کہ وہ نابود ہو جائیں۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:

یَقُوۡلُ الۡکٰفِرُ یٰلَیۡتَنِیۡ کُنۡتُ تُرٰبًا ۔ (۷۸ نباء: ۴۰)۔۔۔ کافر کہ اٹھے گا: اے کاش! میں خاک ہوتا۔

۴۔ وَ عَصَوُا الرَّسُوۡلَ: رسولؐ کی نافرمانی سے المیزان نے رسولؐ کی ولایت کی نافرمانی مراد لیا ہے، شریعت کی نہیں۔ چنانچہ اگر رسولؐ کسی کو بلائیں اور وہ اس بلانے پر رسولؐ کی خدمت میں حاضر نہ ہو تو یہ رسولؐ کی بطور حاکم نافرمانی ہے۔

۵۔ وَ لَا یَکۡتُمُوۡنَ اللّٰہَ حَدِیۡثًا: کافر قیامت کے دن کوئی جرم نہیں چھپا سکیں گے۔ خود اللہ جانتا ہے۔ اس کے اپنے اعضا گواہی دیں گے اور وقت کے رسول بھی گواہی دیں گے۔

بَشِّرِ الۡمُنٰفِقِیۡنَ بِاَنَّ لَہُمۡ عَذَابًا اَلِیۡمَا﴿سورہ نساء آیت ۱۳۸﴾ (اے رسول) منافقوں کو دردناک عذاب کا مژدہ سنا دو۔

الَّذِیۡنَ یَتَّخِذُوۡنَ الۡکٰفِرِیۡنَ اَوۡلِیَآءَ مِنۡ دُوۡنِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ؕ اَیَبۡتَغُوۡنَ عِنۡدَہُمُ الۡعِزَّۃَ فَاِنَّ الۡعِزَّۃَ لِلّٰہِ جَمِیۡعًا﴿سورہ نساء آیت ۱۳۹﴾ؕجو ایمان والوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا حامی بناتے ہیں، کیا یہ لوگ ان سے عزت کی توقع رکھتے ہیں؟ بے شک ساری عزت تو خدا کی ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ بَشِّرِ الۡمُنٰفِقِیۡنَ: منافقین کو دردناک عذاب کی نوید سنا دو۔ منافق کسی عزت و احترام کے قابل نہیں ہیں۔ اس لیے عذاب کی خبر کو خوش خبری کہکر ان کی ایک قسم کی اہانت کی ہے۔

اس آیہ شریفہ میں منافقین کی ایک اہم علامت بیان کی گئی ہے۔ وہ یہ کہ منافقین اپنا قلبی لگاؤ مومنین کی بجائے کفار سے رکھتے ہیں۔ ایسا وہ اس لیے کرتے ہیں کہ ان کے وہم و خیال کے مطابق عزت و تمکنت کفار کے ساتھ دوستی رکھنے کی صورت میں مل سکتی ہے۔

۲۔ فَاِنَّ الۡعِزَّۃَ لِلّٰہِ جَمِیۡعًا: آیہ شریفہ منافقین کے اس زعم باطل کو مسترد کرتے ہوئے واضح کرتی ہے: ’’عزت تو ساری اللہ کی ہے۔‘‘ اگر عزت درکارہے تو اس ذات کی طرف آؤ جو خود صاحب عزت ہے

اور وَ تُعِزُّ مَنۡ تَشَآءُ (۳ آل عمران : ۲۶) تو جسے چاہے عزت دیتا ہے۔

مفہوم عزت: عزت ایک ناقابل تسخیرحالت کو کہتے ہیں۔ صاحب عزت مغلوب ہونے سے محفوظ رہتا ہے اور کائنات میں خدا ہی کی ذات مغلوب ہونے سے محفوظ ہے یا وہ جسے وہ مغلوب ہونے سے تحفظ دے:

وَ لِلّٰہِ الۡعِزَّۃُ وَ لِرَسُوۡلِہٖ وَ لِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ... (۶۳ منافقون : ۸)اور عزت تو اللہ اس کے رسول اور مؤمنین کے لیے ہے۔

اہم نکات

۱۔ یہ آیہ ان لوگوں کے دعوائے ایمان و اسلام کے لیے ایک کھلی دعوت ہے جو عزت و تمکنت کے حصول کے لیے نہ صرف کفار سے دوستی

کرتے ہیں بلکہ ان کے دروازوں پر عزت اور مقام کی بھیک مانگتے ہیں۔

۲۔ قرآن کفار کو دوست بنانے کو ایمان کے منافی قرار دیتا ہے، جب کہ دوستی میں برابری کا تصور ہوتا ہے، لیکن یہ لوگ کفار کا غلام بننے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے ۔

وَ قَدۡ نَزَّلَ عَلَیۡکُمۡ فِی الۡکِتٰبِ اَنۡ اِذَا سَمِعۡتُمۡ اٰیٰتِ اللّٰہِ یُکۡفَرُ بِہَا وَ یُسۡتَہۡزَاُ بِہَا فَلَا تَقۡعُدُوۡا مَعَہُمۡ حَتّٰی یَخُوۡضُوۡا فِیۡ حَدِیۡثٍ غَیۡرِہٖۤ ۫ۖ اِنَّکُمۡ اِذًا مِّثۡلُہُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ جَامِعُ الۡمُنٰفِقِیۡنَ وَ الۡکٰفِرِیۡنَ فِیۡ جَہَنَّمَ جَمِیۡعَۣا﴿سورہ نساء آیت ۱۴۰﴾۔۱۴۰۔اور بتحقیق اللہ نے(پہلے) اس کتاب میں تم پر یہ حکم نازل فرمایا کہ جہاں کہیں تم سن رہے ہو کہ اللہ کی آیات کا انکار کیا جا رہا ہے اور ان کا مذاق اڑایا جا رہا ہے تو تم ان کے ساتھ نہ بیٹھا کرو جب تک وہ کسی دوسری گفتگو میں نہ

لگ جائیں ورنہ تم بھی انہی کی طرح کے ہو جاؤ گے، بے شک اللہ تمام منافقین اور کافرین کو جہنم میں یکجا کرنے والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ قَدۡ نَزَّلَ عَلَیۡکُمۡ: اس مدنی سورے سے پہلے نازل ہونے والے مکی سورے انعام میں پہلے یہ حکم آیا تھا:

وَ اِذَا رَاَیۡتَ الَّذِیۡنَ یَخُوۡضُوۡنَ فِیۡۤ اٰیٰتِنَا فَاَعۡرِضۡ عَنۡہُمۡ حَتّٰی یَخُوۡضُوۡا فِیۡ حَدِیۡثٍ غَیۡرِہٖ ۔۔۔۔(۶ انعام: ۶۸)اور جب آپ دیکھیں کہ لوگ ہماری آیات کے بارے میں چہ میگوئیاں کر رہے ہیں تو آپ وہاں سے ہٹ جائیں یہاں تک کہ وہ کسی دوسری گفتگو میں لگ جائیں۔

سورۂ انعام کی آیہ مکہ میں مشرکین کے بارے میں اور زیر بحث آیہ مدینہ کے یہود کے بارے میں نازل ہوئی۔ مکہ کے مشرکین اور مدینہ کے

یہود اللہ کی آیات کا مذاق اڑاتے تھے۔ مکہ مینکمزور مسلمان ان باتوں کو گوارا کر کے سنتے رہتے تھے۔ انہیں منع کیا گیا کہ ایسی مجلسونمیں سرے سے بیٹھا ہی نہ کریں۔ مدینے میں منافقین ایسی محفلوں میں بیٹھ کر اسلام کا مذاق اڑانے والوں کی باتیں سنا کرتے تھے۔

۲۔ اِنَّکُمۡ اِذًا مِّثۡلُہُمۡ: ورنہ تم بھی انہی کفار جیسے ہو جاؤ گے۔ یعنی تمہارا حشر بھی انہی کے ساتھ ہو گا۔

اللہ، رسول (ص) اور آیات الٰہی کے سلسلے میں غیرت و حمیت ہی ایمان کی علامت ہے۔ اگر کسی محفل میں کسی کے دین و عقیدے کا مذاق اڑایا جاتا ہے تو ممکن ہونے کی صورت میں اس کا دفاع کیا جانا چاہیے، ورنہ اس محفل کا بائیکاٹ کرنا چاہیے جو ہر شخص کے لیے ممکنہ عمل

ہے۔ اگر ایسا بھی نہیں کرتا تو اس کے دل میں اپنے دین و مذہب کے بارے میں غیرت و حمیت نہیں ہے۔ نتیجۃً اس کا دل ایمان سے خالی ہے، جو نفاق کی علامت ہے۔ ان کا ٹھکانا کفار کے ساتھ ہو گا۔

ہمارے معاصر معاشرے میں ہر زمانے کی طرح اصطلاحیں بدل گئی ہیں۔ چنانچہ اگر کسی کے دل میں اپنے دین و مذہب کے بارے میں غیرت و حمیت نہیں ہے اور وہ ایسی محفلوں میں بیٹھ کر اپنے ایمان کا مذاق اڑانا سن سکتا ہے تو اسے ''روشن خیال'' کہا جاتا ہے اوراہل حمیت و غیرت کو ''بنیاد پرست'' کہا جاتا ہے۔

یہ ان لوگوں کے لیے بھی لمحہ فکریہ ہے جو صرف تلاش معاش کے لیے ایمان کے ماحول کو چھوڑ کر کفر کے ماحول میں جانا پسند کرتے

ہیں، جہاں آئے دن اسلامی اقدار کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔

۳۔ اِنَّ اللّٰہَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِیْنَ وَ الْکٰفِرِیْنَ: جس طرح منافقین اور کافرین دنیا میں مؤمنین کی عداوت میں جمع ہو جاتے ہیں، قیامت کے دن یہ دونوں جہنم میں جمع ہو جائیں گے۔

اہم نکات

۱۔ کفریات بکنے کی محفلوں میں بیٹھنے والے کافروں جیسے ہیں۔

الَّذِیْنَ یَتَرَبَّصُوْنَ بِکُمْ ۚ فَاِنْ کَانَ لَکُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰہِ قَالُوْۤا اَلَمْ نَکُنْ مَّعَکُمْ ۖ وَ اِنْ کَانَ لِلْکٰفِرِیْنَ نَصِیْبٌ ۙ قَالُوْۤا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَیْکُمْ وَ نَمْنَعْکُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ؕ فَاللّٰہُ یَحْکُمُ بَیْنَکُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ ؕ وَ لَنْ یَّجْعَلَ اللّٰہُ لِلْکٰفِرِیْنَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ سَبِیْلًا﴿سورہ نساء آیت ۱۴۱﴾۔ یہ (منافق) تمہارے حالات کا انتظار کرتے ہیں کہ اگر اللہ کی

طرف سے تمہیں فتح حاصل ہو تو کہتے ہیں: کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے؟ اور اگر کافروں کو کچھ کامیابی مل جائے تو (ان سے) کہتے ہیں: کیا ہم تمہارے خلاف لڑنے پر قادر نہ تھے؟ (اس کے باوجود ہم نے تمہارے ساتھ جنگ نہ کی) اور کیا ہم نے تمہیں مومنوں سے بچا نہیں لیا؟ پس اللہ قیامت کے دن تمہارے درمیان فیصلہ کرے گا اور اللہ ہرگز کافروں کو مومنوں پر غالب نہیں آنے دے گا۔

تشریح کلمات

التربص:(ر ب ص) انتظار۔

الاستخواذ:(خ و ذ) غلبہ۔ تسلط۔

تفسیر آیات

۱۔ الَّذِیۡنَ یَتَرَبَّصُوۡنَ بِکُمۡ: منافقین کی دوسری صفت یہ ہے کہ وہ ابن الوقت ہوتے ہیں اور ہمیشہ مفاد کا انتظار کرتے ہیں۔ اسی لیے طرفین سے روابط رکھتے ہیں۔ مسلمانوں کے ساتھ ظاہری شمولیت

کو اپنے مفاد کا ذریعہ بناتے ہیں۔ اپنی وفاداریوں کے ذریعے کفار سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ان کی تمام تر سازشوں اور کوششوں کے باوجود اللہ کفار کو مومنین پر غالب آنے کی نوبت ہرگز نہیں آنے دے گا۔ یعنی صرف آخرت میں ہی نہیں بلکہ دنیا و آخرت دونوں میں کفار کا مومنین پر غلبہ نہیں ہو گا:

وَ لَا تَہِنُوۡا وَ لَا تَحۡزَنُوۡا وَ اَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ﴿﴾ (۳ آل عمران : ۱۳۹)ہمت نہ ہارو اور غم نہ کرو کہ تم ہی غالب رہو گے بشرطیکہ تم مومن ہو۔

ایمان کی شرط ضروری ہے۔ کیونکہ اگر کسی بھی اقدار پر ایمان نہیں ہو گا تو اس کی کامیابی کے لیے اور کوئی ضمانت نہیں ہو سکتی ۔ ایمان سے طاقت، عزم اور ارادے میں پختگی اور صبر و حوصلہ ملتا ہے، جو کامیابی کے راز ہیں۔ یہ بات

بھی ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ مذکورہ اثرات خود ایمان پر مترتب ہوتے ہیں، صرف دعوائے ایمان پر نہیں۔ فیض، سخاوت سے حاصل ہوتا ہے، دعوائے سخاوت سے نہیں۔

۲۔ فَاِنۡ کَانَ لَکُمۡ فَتۡحٌ: اگر تم اہل ایمان کو فتح و نصرت مل جائے تو یہ منافقین یہ جتانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھی ہیں، ہم کو بھی غنیمت میں حصہ ملنا چاہیے۔ منافقین کبھی جنگوں میں مسلمانوں کے ساتھ نکلتے تھے اور لشکر اسلام میں خلل اور بدنظمی پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ فتح ملنے کی صورت میں نعرہ لگانے میں آگے ہوتے تھے۔

۳۔ وَ اِنۡ کَانَ لِلۡکٰفِرِیۡنَ نَصِیۡبٌ: اگر کافروں کو کامیابی کا کوئی حصہ مل جاتا تو یہ لوگ کافروں سے کہتے: ہم ان مسلمانوں کے ساتھ مل کر

تمہارے خلاف لڑ سکتے تھے لیکن ہم نے تمہارے خلاف لڑائی نہیں کی، اس طرح ہم نے تم کو اہل ایمان سے بچا لیا۔

۴۔ فَاللّٰہُ یَحۡکُمُ بَیۡنَکُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ: قیامت کے دن جب فیصلہ سنایا جائے گا تو اس وقت تمہاری فریب کاری نہیں چلے گی۔

۵۔ وَ لَنۡ یَّجۡعَلَ اللّٰہُ لِلۡکٰفِرِیۡنَ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ سَبِیۡلًا: اللہ ہرگز کافروں کو مؤمنوں پر غالب نہیں آنے دے گا۔ بعض مفسرین کے نزدیک سبیل سے مراد وہ فتح و غلبہ ہو سکتا ہے، جس سے امت مسلمہ کا نام و نشان نہ رہے اور کفار کا بول بالا ہو۔

بعض کے نزدیک سبیل سے مراد دلیل و حجت ہے کہ کفار دلیل و منطق میں غالب نہیں آئیں گے۔

بعض مفسرین کے نزدیک سبیل سے مراد فتح و غلبہ ہے لیکن یہ ایمان کے ساتھ مربوط ہے۔ اگر ایمان میں کمزوری آ جائے تو فتح و غلبہ میں بھی کمزوری آئے گی۔ جیسا کہ فرمایا:

وَ لَا تَہِنُوۡا وَ لَا تَحۡزَنُوۡا وَ اَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ﴿﴾ (۳ آل عمران : ۱۳۹)یعنی اگر تم مؤمن ہو تو بالا دست رہو گے۔

اہم نکات

۱۔ایمان کو انسانی مقدرات میں وہی مقام حاصل ہے جو اس کائناتی نظام کے دیگر مادی و معنوی عوامل کو حاصل ہے۔ اس کائناتی نظام میں جس طرح اثر کی کمزوری سے مؤثر کی کمزوری کا پتہ چلتا ہے، بالکل اسی طرح آثار کی کمزوری سے ایمان کی کمزوری کا پتہ چلتا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

(مختصر سوانح حیات مولانا سید عمران حیدر عابدی غازی قمی)

نام سید عمران حیدر

لقب عابدی

والد گرامی سید رسالت علی عابدی

مقام ولادت پٹنہ سیوان

سن پیدائش یکم مئی سنہ ۱۹۹۶بمطابق یکم ذیقعدہ

ابتدائی تعلیم اپنے ہی وطن گرام بتھور پوسٹ کریم الدین پور ضلع غازی پور سے کی

ثانوی تعلیم دو مدرسہ سے کی ہیں ۱ حوزہ علمیہ امام حسن عسکری علیہ السلام کانودر گجرات

۲ جامعہ امامیہ انوار العلوم آلہ آباد

اعلیٰ تعلیم قم المقدس ایران

قومی خدمت دوران تعلیم حوزہ علمیہ امام حسن عسکری علیہ السلام کانودر گجرات میں مختلف موضوعات پر مقالہ لکھا اور مختلف علاقوں میں مجالس و محافل ونماز جمعہ و تبلیغ کے فرائض انجام دیں اور ایران سے واپسی کے بعد تقریباً چھ ماہ حوزہ علمیہ امام حسن عسکری علیہ السلام کانودر گجرات میں تدریس کے فرائض انجام دیں

*۲۰۰۸ سے لیکر ۲۰۱۰*تک گجرات مدرسہ میں میرے شفیع و مہربان اساتذہ کرام پرنسپل مولانا سید منور رضا نقوی صاحب مولانا کرار حسین ترابی صاحب مولانا ضمیر حیدر صاحب مولانا امیر علی گجراتی صاحب مولانا محمد حیدر فیضی صاحب مرحوم چچا عباس گجراتی صاحب*

۲۰۱۰ سے لیکر ۲۰۱٤ تک مدرسہ آلہ آباد میں میری شفیع و مہربان اساتذہ کرام پرنسپل جواد حیدر جودی صاحب مولانا رضی حیدر صاحب مولانا محمد عباس صاحب مولانا کلب عباس صاحب مولانا کلب حیدری صاحب مولانا صغیر حسن صاحب مولانا احسن عباس صاحب مولانا عمار صاحب مولانا ضرغام صاحب مولانا ضمیر حیدر صاحب مولانا مرحوم حیدر علی صاحب مولانا طاہر صاحب جناب کمال صاحب جناب خشنود صاحب جناب ذیشان حیدر صاحب

آلہ آباد مدرسہ چھوڑنے کے میں دوبارہ مدرسہ حوزہ علمیہ امام حسن عسکری علیہ السلام کانودر گجرات گیا تھا

*۲۰۱٤ سے لیکر ۲۰۱۵ تک گجرات مدرسہ میں میرے شفیع و مہربان اساتذہ کرام پرنسپل مشیر

حسین نقوی صاحب مولانا یاسین حسین عابدی غازیپوری زینبی صاحب مولانا علی عباس صاحب مولانا نعیم گوھر صاحب مولانا شمیم صاحب مولانا ظہیرالحسن صاحب مولانا علی اکبر موسی صاحب مولانا عزیز عابدی صاحب مولانا علی منظر صاحب*

۲۰۱۵ سے لیکر ۲۰۱۹ تک میں قم المقدس ایران میں میرے شفیع و مہربان اساتذہ کرام مولانا عقیل معروفی صاحب مولانا فیض باقری صاحب آغا مؤمنی صاحب آغا اجودانی صاحب آغا سلامی صاحب آغا غضنفر پور صاحب آغا دیانی صاحب آغا علی حسینی صاحب آغا حیدر رضا زیدی صاحب آغا سعیدی صاحب آغا روزی علی عابدی صاحب وغیرہ تھیں

مولانا مشیر حسین صاحب بعد پرنسپل کا مقام مولانا سید یاسین حسین عابدی غازیپوری زینبی صاحب سنبھالا تھا اور انہیں نے ہی مجھے اور میرے کلاس ساتھی جناب انوار علی زیدی صاحب کو ایران کے لئے روانہ کیا تھا

میں انکا بہت بہت شکر گزار ہوں کہ انہوں نے ہم لوگوں کو ایران بھیجنے میں جو زحمت و مشکلات کا سامنا کیا شاید وہ کوئی اور نہ کرتا واقعآ ایک باپ کی طرح سے اپنے فرائض کو انجام دیا ھے میں جنتا بھی انکے بارے میں بیان کرو وہ کم ہی ھے آج جو کچھ بھی میں ہو انہیں اساتذہ کرام کی محنت و محبت کا نتیجہ ھے مجھ جیسا حقیر اگر پوری زندگی بھی حق ادا کرنا چاہیے تو نہیں کرسکتا

بس آخر میں بارگاہ خداوند عالم میں دعا ھے کہ میرے سارے اساتذہ کرام کو اپنے حفظ و امان میں رکھیں اور انکی نیک حاجات کو پورا فرمائے اور ہمیں حق اساتذہ کرام انجام دینے کی توفیق عطا فرمائے الہی آمین

فقط والسلام

از طرف بندہ حقیر مولانا سید عمران حیدر عابدی غازی پوری قم المقدس ایران

موبائل نمبر ایران 989012801178

+91 8448510476

*التماس دعا

نام سید فیض ظفر رضوی

والد گرامی سید ظفر عباس رضوی

وطن کٹہوکھری چہپرہ بیہار

.ابتدائی تعلیم مینے اپنے وطن چہپرہ بیہار میں حاصل کی .اعلی تعلیم کہ لیے قم المقدس کا انتقاب کیا .شفیع استاد میں سبسے پہلا نام استاد محترم جناب معصوم صاحب کا آتا ے جن کی محبت کہ نتیجہ میں آج میں اس مقدس مقام پر علم حاصل کر رہا ہو اسکے بعد استاد محترم جناب صابر صاحب و استاد محترم غلام پنجتن و استاد محترم مجتبی صاحب معروف پوری

ثانوی تعلیم مدرسہ امام حسین چہپرہ بیہار میں حاصل کیا جہا مجھے کافی اچھے استاد موثر ہوے جن کے آسما کچھ اسطرح ہیں ۱ استاد محترم جناب غلام پنجتن ۲ استاد محترم جناب عسکری صاحب کو پا کنج ۳ استاد محترم مجتبی صاحب

معروف پوری ۴ استاد محترم سید مظاہرہ صاحب ہرییاس سیوان۔

۵ استاد محترم عارف عباس صاحب بارہبنکی۔

اعلی تعلیم ابہی مدرسہ امام رضا ایران میں حاصل کر رہا ہو جہا مجھے ایران کہ کافی اچھے استاد نصیب ہوے جن کے آسما اسطرح سے ہیں ۱ استاد محترم فراہانی گرگانی ۲ استاد محترم فاظل افغانستان ۳ استاد حیدری ایران ۴ استاد عبدی اراکی

بسم تعالی

نام : علامہ ندیم الحسن قمی

والد کا نام: محمد اسلم

دنیاوی تعلیم : F.A پاکستان کے معروف شہر چکوال سے کیا

دینی تعلیم : مدرسے کی ابتدائی تعلیم پاکستان راولپنڈی میں مدرسہ دانشگاہ جعفریہ میں

استاد العلما الحاج علامہ سید محسن علی ھمدانی صاحب کے زیر نگرانی حاصل کی۔

لمعہ پڑھنے کے میں ایران آگیا اور عرصہ چار سال سے بین الاقوامی اسلامک یونیورسٹی جامعۃ المصطفی میں زیر تعلیم ہوں۔

اپنے زندگی میں غیر ممکنہ حد تک علوم آل محمد کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچایا اور لوگوں کو حق بتایا۔

نام : سید ضرغام حیدر رضوی

والد..سیدافتخارپنجتن

تولد..یکم جنوری ۱۹۷۸

ابتدائی تعلیم امجدیہ کراری

درمیانی..انوارالعلوم اللہ آباد

اعلی تعلیم .. قم المقدس ایران

خدمت درس تدریس ..دوسال جامعۃالمنتظر نوگاواں سادات امروہ اسکے بعد

پھر جامعہ امامیہ انوارالعلوم آلہ آباد میں نظارت اور تدریس کےفرائض جاری ھے